

غالب کی شخصیت اور شاعری

رشید احمد صدیقی

مکتبہ جامعہ ملیٹڈ

اشتراك

فوجی کنسٹیبل افونگ ایرو بین بائیو ہل

غالب کی شخصیت اور شاعری

رشید احمد صدیقی

مکتبہ جامعہ ملیٹڈی

اشتراك

فوج کو نسلی بارے فوج اُڑھن بانی عالم

Ghalib Ki Shakhsiat Aur Shairy

by

Rashed Ahmad Siddiqi

Rs.58/-



صدر دفتر

011-26987295

مکتبہ جامعہ لمیثڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی - 110025

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیثڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی - 110006

022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیثڈ، پرس بلڈنگ، ممبئی - 400003

0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیثڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ - 202002

011-26987295

مکتبہ جامعہ لمیثڈ، بھوپال گراونڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی - 110025

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

قیمت: 58 روپے

تعداد: 1100

سال اشاعت: 2012

سلسلہ مطبوعات: 1637

ISBN: 978-81-7587-805-1

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروع اردو زبان، فروع اردو بھومن 9/FC-33، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسول، نئی دہلی - 110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ایمیل: www.urducouncil.nic.in ویب سائٹ: urducouncil@gmail.com

بانی ٹیک گرافس، ڈی 2/8، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز ۱۱، نئی دہلی 110020

اس کتاب کی چھپائی میں TNPL Maplitho GSM 70 کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چند معرفوں کا سلسلہ

مکتبہ جامعہ ایڈیشنز ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادبیوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتی کا سلسلہ کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلباء کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دلچسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ”معیاری سیریز“ کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب الین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلباء مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بظہر احسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی متوجی ہوتی رہی مگر اب برف پکھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں ان میں سے دوسو نائنٹھل قومی کوسل برائے فرود غاردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے باشرکت غیرے شائع کی ہیں)۔ زیرِ نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کوسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں
مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹریس کے چیر مین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس)
واس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چھپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لاائق بتائش اور
ناقابل فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کامنون احسان رہے گا۔ قومی کوسل برائے فروع اردو زبان
کے ارباب حل و عقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پر خلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ
تھا۔ اولین مطبوعات میں کوسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جا چکا
ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کوسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرم الدین صاحب کی
خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہو رہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کوسل کے واس
چیر مین پروفیسر و سیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید
کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود

نجیب جنگ ڈائرکٹر

مکتبہ جامعہ لمیڈیڈ، نئی دہلی

شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی

کے بانی

اردو کے نامور محقق، نقاد

اور صاحب طرز انسٹا پرداز

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

کے نام

ایسا کہاں سے لاوں کہ تجھ سا کہیں جسے

پیش لفظ

پہلے صدر جمہوریہ ہند اور دہلی یونیورسٹی کے وزیر آں جہانی ڈاکٹر اجتدر پر شاد کے اعلان (مورخہ ۹ نومبر ۱۹۵۹ء) کی رو سے دہلی یونیورسٹی میں اردو کا علاحدہ شعبہ قائم ہوا۔ اس شعبہ کا قیام پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی لگن جدوجہد، خلوص اور مسامی جمیلہ کا شمرہ تھا۔ یہ خواجہ صاحب ہی تھے جنھوں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد آزاد ہندستان میں اس وقت اردو کی ترویج بقا اور اسے جدید مزاج دینے کی ان تھک کوشش کی جب اردو کے لیے نضا ساز گار نہیں تھی۔ اس پر آشوب دور میں موصوف ہی نے ایک علاحدہ اردو یونیورسٹی کا خواب بھی دیکھا تھا۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے نامساعد حالات میں دہلی یونیورسٹی میں علاحدہ شعبہ ہی قائم نہیں کرایا بلکہ اسے یونیورسٹی کا ممتاز و منفرد شعبہ بنانے کے لیے طرح طرح کے منصوبے بنائے۔ مخطوطہ شناسی، مجلہ اردوئے معلیٰ تحقیق و تصنیف و لسانی لغت، مختلف کالجوں میں اردو کی درس و تدریس کا اہتمام نیز علاحدہ شعبہ کا قیام ڈپلوما ان ٹریننگ اردو نصاب میں معنی خیز اور دورس تبدیلیاں خواجہ صاحب کی اردو سے محبت اور قلبی تعلق کی مظہر ہیں۔ یہ خواجہ صاحب ہی کی ذات تھی کہ ارباب علم و دانش اور ارباب اقتدار نے ہمیشہ شعبہ اردو کو بے نظر احسان دیکھا۔ خواجہ صاحب ہی نے حیدر آباد جا کر نظام نژاد کے سر برہ نواب مughum جاہ سے شعبہ کے لیے ایک رقم مختص کرائی تاکہ اس مالی امداد سے نظام اردو خطبات کا سلسلہ شروع کیا جائے اور مقتدر اہل علم، علمی ادبی اور سائنسی موضوعات پر خطبات دیں۔

زیرِ نظر کتاب غالب شخصیت اور شاعری، نظام اردو خطبات کے تحت پروفیسر رشید احمد صدیقی کا خطبہ ہے۔ رشید صاحب نے پہلی غالب صدی پر ۱۹۶۹ء میں دہلی یونیورسٹی میں یہ خطبہ دیا تھا۔ بعد ازاں ۱۹۷۰ء میں یہ خطبہ شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوا۔ ۱۹۷۸ء میں اس کی دوسری اشاعت عمل میں آئی۔ اب ۱۹۹۸ء میں اس کی تیسرا اشاعت کا پہلا جواز اس خطبہ کی

مقبولیت اور دوسرے سال روایت میں غالب کا دوسرا سالہ یومِ ولادت ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں
غالب ہمارے قومی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری معاشرتی زندگی میں اس طرح غالب
آچکے ہیں کہ ہر شخص اپنے مزاج ذوق اور حالات کے مطابق ان کے کلام سے استفادہ کرتا رہا
ہے اور کرتا رہے گا۔ غالب کی مقبولیت اور عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان سے وابستہ ہر
شخص ہمارے ادب کا جیتا جا گتا کردار بن گیا ہے۔ غالب کے دوسرا سالہ یومِ ولادت اور دہلی
یونیورسٹی کی پلاتینیم جوبی کے موقع پر یہ خیال آیا کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا خطبہ غالب کی
شخصیت اور شاعری (نظم اردو خطبہ نمبر ۳) شائع کیا جائے جو غالب کے تیس خراج عقیدت
بھی ہے اور باذوق قارئین کی تسلیم کا سامان بھی۔ میرے لیے مقامِ سر تھے کہ شعبہ کے
تمام ارکیس خصوصاً اکثر تو قیر احمد خاں نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور اس کی اشاعت کے لیے
بھرپور تعاون دیا۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس خطبے کی تیری اشاعت کے لیے مکتبہ جامعہ لمیڈنڈ
کے جزل منجھر جناب شاہد علی خاں صاحب نے خصوصی دلچسپی لی اور اسے شائع کرنے کا اہم
فیصلہ کیا۔ میں اپنے رفقاء کارکار کا ضمیم قلب سے شکر گزار ہوں نساتھ ہی محمد فروز صاحب لیکچر ار
ڈاکٹر حسین کا لج اور ارشاد نیازی صاحب ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی کا بھی جنھوں نے پروف
ریڈنگ کی اہم ذمہ داری کو انجام دیا۔

(پروفیسر) امیر عارفی

۱۹۹۸ء

صدر شعبہ اردو

دہلی یونیورسٹی، دہلی

خطبہ اول

غالب کی شخصیت

جناب صدر، خواتین و حضرات!

دلی مدتوں سے اردو کا آستانہ رہی ہے۔ خیال تو یہاں تک ہے کہ دہلی اردو کا وطن اور گہوارہ ہے۔ زبان کا تعلق دل سے ہے اور جس زبان میں ہندستان کی رنگارنگ تہذیب کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے، اس کا تعلق ہندستان کے دل یعنی دلی سے ہو نافطری سا ہے۔ پھر آپ کی یونیورسٹی نے اردو زبان کی جو مشاٹگی کی ہے، وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ کم وقت میں ایک نسبتاً کم عمر یونیورسٹی کے جواں سال شعبے کو اس طرح متعارف و ممتاز کرنا کہ اربابِ ذوق کی نظریں اُس پر پڑنے لگیں، آپ کا کارنامہ ہے جس کے لیے دہلی یونیورسٹی کے اربابِ علم و اختیارِ لائق تہذیت ہیں۔ دہلی کا تعلق اردو سے بھی ہے اور غالب سے بھی، یہ کم و بیش دونوں کا وطن ہے۔ اس لحاظ سے دہلی یونیورسٹی میں غالب شناسی کا یہ اقدام گویا غالب کے لفظوں میں ہخن کا قرض تھا جو اس طرح ادا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ دہلی یونیورسٹی میں اردو کا کام روز بروز توسعی پاتا اور ترقی کرتا ہے گا اور غالب کی وساطت سے یہ تعلق زیادہ گہرا، پاییدار اور وقیع تر ہو گا۔

آپ نے سنا ہو گا، بادشاہ منتخب کرنے کا کبھی یہ طریقہ بھی رہا ہے کہ دارالخلافت کے اکابر استقبالیہ کمیٹی کی حیثیت سے منہ اندھیرے شہر پناہ کے صدر دروازے پر جمع ہوتے اور پہلا جو شخص شہر میں داخل ہوتا اس کو اپنا بادشاہ قرار دے کر مقررہ شاہی مراتب اور دھوم دھام کے ساتھ شہر میں لاتے، تاج و تخت اور اپنی عزت و عافیت اس کے پر دکر دیتے۔ عجب نہیں جس منصب پر آج آپ نے مجھے سرفراز کیا ہے، اس میں اسی روایت کا احترام کیا گیا ہو، شاید اس فرق کے ساتھ کہ میری عزت و عافیت حاضرین و سامعین کے ہاتھ میں رہے گی۔ دوسرے یہ کہ توصیف و تحسین کے جن کلمات سے میرا تعارف کرایا گیا ہے، ان سے دل خوش ہوا، اس لیے اور کہ اس سے پہلے اپنے بارے میں اتنی اچھی

رائے نہیں رکھتا تھا۔

جس طرح کے بادشاہ کا ذکر کر آیا ہوں، وہ کسی قانون یا رسم و روایت کا پابند نہیں ہوتا تھا اس لیے کہ ان سے ناقص ہوتا، کبھی کبھی ان کا مخالف بھی۔ مجھ سے بھی اس طرح کی باتیں سرزد ہوں تو پریشان نہ ہو جائے گا؛ پشمیان ہونے میں حرج نہیں۔ عقلمند آدمی اپنی برائی سن کر اتنا متذكر نہیں ہوتا جتنی اپنی تعریف سن کر۔ اس لیے کہ پہلی صورت میں بارہ ثبوت مدعی پر ہوتا ہے، دوسری میں مددوح پر۔ یوں بھی میں اتنا عقلمند نہیں ہوں جتنا شکری۔ اس لیے اپنی تعریف سن کر اس وسو سے میں بتلا ہو گیا ہوں کہ ایسا تو نہیں ہے کہ آپ نے کلماتِ تحسین کی ذمے دار ہی مجھ پر ڈال دی ہو کہ میں ان کی تائید و توثیق موجودہ ممتاز و منتخب اجتماع سے حاصل کروں لیکن اس کا یقین اور اس لیے اطمینان ہے کہ نوجوان بوڑھوں کو آزمائیں میں نہیں بتا کرتے، ان کی آبرو کے امین و محافظ ہوتے ہیں۔

بہ نظر احتیاط یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آج کی گفتگو کے دو حصے ہیں ایک غالب کی شخصیت دوسرا ان کی شاعری سے متعلق ہے۔ لیکن کہیں کہیں یہ خلط ملط ملیں تو عجب نہیں۔ یہ قصور میرا ہے جس میں غالب کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ غالب پر سوچئے تو ان کا کلام اور ان کے کلام پر غور کچھ ہے تو غالب بن نیلائے سامنے آ جاتے ہیں۔ اچھے شاعر اور ان کے کلام کا حال کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے، لیکن یہ میرے طرزِ فلکر کا بھی قصور ہو سکتا ہے۔ جس طرح پیکر تراشی، شعر اکا بہت بڑا ہنر ہے، اسی طرح شاعری میں شخص کا تلاش کرنا میری بڑی کمزوری ہے۔ اسے آپ معاف فرمائیں یا نہیں مجھے معدود ضرور سمجھیں۔

اس صدی کے شروع میں جن شعراء کے اشعار طوالِ گلوں کے گانے اور شایستہ لوگوں کی زبان پر سب سے زیادہ آتے تھے، وہ داغ اور امیر تھے۔ شاعری کے عوامی نہیں عام پسند ہونے کی اس زمانے میں ایک پہچان یہ بھی تھی۔ اس نوع کی شاعری اُس عہد کی عیش سامانی کے مطابق تھی۔ یوں بھی اس زمانے میں شاعری اور عاشقی زیادہ ہوتی تھی، جیسے آج کل شاعری زیادہ اور عاشقی کم ہوتی ہے۔ مشق میں قحط پڑنے سے عاشقی فراموش ہو گئی تھی۔ ہمارے ہاں معلوم نہیں کیا کم ہونے پر شاعری کم ہونے لگے گی۔

دَائِغ اور امیر کا یہ دور طوائف اور تعلقے داروں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ جدید ذہن کے بعض اکابر نے لکھنؤ میں غالب کو متعارف کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اس کا اثر بھی ہوا لیکن اتنا ہی جتنا کہ اس وقت کے لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود کا نہیں تو نمود کا ہو سکتا تھا۔ اودھ بیج نے تہذیب الاخلاق سر سید اور حآلی کے خلاف زبان اور شاعری کی میکائیکی پر داخت اور حقائق سے گریز کا محاذ جس شدومد سے قائم کیا تھا، وہ نئی زندگی کی صد اقوال کے سامنے خس و خاشاک کی دیوار کھڑی کرنے کی بے سود کوشش تھی۔ سر سید اور حآلی نے اس ایک طرفہ جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا لیکن زندگی اور ادب کے نئے تقاضوں کو پہچاننے اور ان سے عہدہ بر آہونے میں جو کامیابی سر سید اور حآلی کو ہوئی وہ بڑی نمایاں اور نتیجہ خیز تھی۔ دوسری طرف جدید اردو جس کی ابتدافورٹ ولیم کالج سے ہوئی اور جو ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی دلتی کالج تک پہنچی تھی، اس کو موڑو مقبول عام کرنے میں غالب کے خطوط، سر سید کے مضامین اور علی گڑھ تحریک کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ہر بڑی تہذیب کے زوال پر نئے عہد کے کچھ مسائل سامنے آتے ہیں مثلاً یہ کہ قدیم تہذیب میں کون سے اجزایا عناصرا یے ہیں جو نئے عہد کے مطالبات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو اس فشار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے مونخر الذکر ختم ہو جاتے ہیں لیکن جن عوامل میں اس چیلنج کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ اپنی گزشتہ افادیت اور اہمیت کو قائم رکھتے ہیں اور نئی تہذیب کے صحت مند اور فعال عناصر کو پروبال دیتے اور مہمیز کرتے ہیں۔ اس طور پر اگر ماضی کے صحیح و صالح عناصر و عوامل، حال کی دلگیری نہ کریں تو حال بے حال ہو جائے۔

غالب شناسی کا سلسلہ غالب کے دورہی سے شروع ہوا اور اس قابل قدر سرمایہ میں کوئی معقول اضافہ کرنا آسان نہیں ہے۔ حآلی نے یادگارِ غالب لکھی جس نے ارباب علم و فضل کو غالب کی شخصیت اور ان کے شعری و نثری کارناموں کی طرف متوجہ کیا۔ حآلی نے یہ چراغ کچھ ایسی نیک ساعت میں اور مبارک ہاتھوں سے روشن کیا تھا کہ اس کی لو

وقت کے ساتھ ساتھ تیز سے تیز تر ہوئی گئی۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجوری نے غالب کو اتنی اوپنچی محراب پر سجادیا کہ سب کی نظریں حیرت اور مسراست سے اس کی طرف مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ انہوں نے مغرب کے اعلاء شعر اور مفکرین کی صفت میں غالب کو لاکھڑا کیا۔ ڈاکٹر سید محمود نے ان کو ایک محبو وطن اور انقلاب پسند کی حیثیت سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر عبداللطیف کے اختلافی حاشیوں کے ساتھ غالب شناسی کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا جن میں غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرم، مہیش پرشاد، مالک رام، امتیاز علی عرشی، خلیفہ عبدالحکیم اور دوسرے مستند مصنفوں اور اہل قلم سامنے آتے ہیں۔ تنقید و تحقیق کا یہ کارروائی برابر سرگرم سفر ہے۔ اسی طرح غالب کے اردو کلام کی شرح لکھنے والوں مثلاً حاجی، نظم طباطبائی، حضرت موبانی، نظامی، بیخود دہلوی، سہا مجددی، جعفر علی خاں آثر جوش مدنیانی، نیاز فتحپوری، آغا محمد باقر اور بیشمار دوسرے اکابر کے فکر و نظر سے ہم روشناس و مستفید ہوئے۔

خیال ہے کہ گزشتہ سو سال کے اندر غالب کے اردو کلام پر جتنی شر میں لکھی گئیں اتنی ہندستان میں اردو یا فارسی کے کسی اور شاعر کے کلام پر تصنیف نہیں ہوئیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالب کو سمجھنے یا سمجھانے کا مطالبہ عوام اور خواص دونوں میں کتنا قوی رہا۔ ہندستان میں اردو کے اکابر فارسی شعر اکے کلام کو سمجھنے میں پڑھے لکھے اور گوں کو بالعموم زیادہ وقت نہیں ہوتی تھی۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ وہ فارسی کے کلائیکی شعر اکے مقابلہ میں غالب کے فارسی کلام کو زیادہ قابل اعتمان سمجھتے ہوں۔ دشواری اس وقت محسوس ہوئی جب غالب نے فارسی کو اعلاء سطح پر براہ راست اور کثرت سے اردو شاعری میں داخل کر کے اس کو استوار و آرائستہ کرنے اور نئی و سعیتیں دینے کی کوشش شروع کر دی۔ اردو جانے والوں کا عام طبقہ اس انداز کی شاعری کے سمجھنے سے معذور لیکن مشتاق تھا۔ دوسری طرف غالب کے اردو کلام سے ان کا اتنا گر ویدہ ہو چکا تھا کہ ان کی فارسی آمیز شاعری کو بھی سمجھنے کا خواستگار ہوا اس لیے اردو کلام کی اتنی شر میں لکھی گئیں اور غالب کے متفرق اشعار بھی معرض بحث میں آتے رہے۔ غالب سے روز بروز بڑھتی ہوئی عالمگیری عقیدت کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ غالب شناسی کا رجحان ترقی کرتا رہے گا۔

غالب ہماری تنقید و تحقیق کے لیے ہے مرد افگن عشق کا درجہ رکھتے ہیں، جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہمارے بہترین ذہنوں نے اپنی صلاحیتیں صرف کی ہیں۔ غالباً شناسوں کی اس صفت میں کیسے کیسے رفیقوں اور عزیزوں کے کیسے کیسے چہرے ہیں جن کے کارناموں کے شمارے کے لیے اس مقاولے کا دامن تنگ ہے۔ پھر اس پھول کی خوشبو کیسے کیسے دیار و امصار میں پھیلی! ذاکر صاحب نے مطبع شرکت کا ویانی برلن سے دیوانِ غالباً کے شاید اب تک سب سے خوبصورت پاکٹ اڈیشن کی اشاعت کا انتظام کیا اور مشہور جرمن مصور نے وہ شہرہ آفاق تصویر بنائی جو مدتوں تک غالباً کی اصل شخصیت کی جگہ پر کرتی رہی۔ مصوروں میں عبدالرحمٰن چغتائی نے ان کے اشعار کو مرقع کا پیرایہ دیا۔ ملک کے نامور موسیقاروں نے غالباً کی غزلیں گائیں۔ غالباً کی فلم تیار کی گئی اور مقبول ہوئی۔ شاعروں اور افسانہ نویسوں نے ان کے اشعار کا اپنے افسانہ و افسوس کا سر نامہ بنایا۔ اپنے ملک کی سرحدوں سے باہر بھی غالباً شناسی کی تحریک مقبول ہوتی رہی۔ ازبکستان سے لے کر دور دراز امریکہ تک غالباً کی شہرت موج در موج پھیلتی چلی گئی۔ سو برس بعد بھی اس کی شاعری اور شخصیت کا جادو، سکتا راجح وقت ہے!

ہمارے ادب میں غالباً اپنے ذہن اور ذوق کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ذہن کی خوبی کا معیار اس کی بیداری اور اس کی دسترس ہے۔ اس معیار سے غالباً اور ان کے معاصرین کا جائزہ لیں تو غالباً کی فوقیت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے۔ ذوق، ذہن کی تربیت کے مدارج کو ظاہر کرتا ہے۔ اس بارے میں غالباً کی فضیلت اس بے نظیر خوش مذاقی اور خوش سلیقگی سے ظاہر ہوتی ہے جو ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ غالباً کے غیر معمولی شخص اور شاعر ہونے کے بارے میں کون شبہ کر سکتا ہے جب اس کی گواہی دینے میں ان کے عہد کے تمام معتبر و محترم اشخاص ہم زبان ہیں۔ اعلاذ، ذہن ذوق اور ظرف کا جتنا متنوع ہم آہنگ اور حسین امتزاج غالباً کے یہاں ملتا ہے وہ باستثناء اقبال ہمارے کسی اور شاعر یا ادیب کے حصے میں نہیں آیا۔ ان کی شخصیت اور شاعری ہماری تہذیبی زندگی کا ایسا سرچشمہ ہے جو اعلاء تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کی مسلسل آبیاری کرتا رہے گا۔ اس کی

شہادت اس کام سے ملتی ہے جو اب تک غالب پر ہوا ہے جس کی بنا پر ہمارے شعروادب میں غالبات کو ایک مستقل مطالعے کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، جس کی نوعیت اور فقار کو دیکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ با قاعدہ تدوین و تحریکے کے لیے مستند اربابِ فکر و فن کی مدد سے اور مشورے سے ایک جامع منصوبہ تیار کیا جائے۔

اس سلسلے میں آپ کی توجہ A COMPANION TO SHAKESPEAR'S STUDIES

کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ۱۹۳۲ء میں انگلستان میں شائع ہوئی تھی۔ جس میں شیکسپیر کے متعلق مستند کاموں کی نہایت عالمانہ اور ماہرانہ تلمیحیں و تشریع پیش کی گئی ہے جس نے شیکسپیر کا مطالعہ کرنے والوں کی رہنمائی میں بیش بہا مدد دی۔ ہمارے یہاں غالب اور اقبال پر اس قسم کی کتاب کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کام نہایت امید و اعتماد کے ساتھ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سپرد کر سکتے ہیں جس کے لاکٹ صدر اور ارکین نے اردو میں علمی اور ادبی کاموں کا نہایت اعلا اور امید افزای معیار قائم کیا ہے۔

غالب کے سوچنے اور کہنے کا انداز اُس وقت کی اردو شاعری کی روایات سے علاحدہ اجنبی اور بلند تھا۔ وہ جو کچھ سوچنے تھے یا جس طرح سوچنے تھے وہ اتنا ہندی یا اسلامی نہ تھا جتنا عجمی۔ عقیدے اور ذہن دونوں اعتبار سے وہ عقبی کے اتنے قائل نہیں معلوم ہوتے تھے جتنے عجم کے۔ ان کا انسان اقبال کا انسان تھا نہ نیٹھے کا۔ وہ کلیتًا غالب کا تھا اور غالب اپنے ہر قول اور فعل کا جواز ”آدم زادہ ام“ میں نہ صرف ڈھونڈتے تھے بلکہ اس پر فخر بھی کرتے تھے۔ کہتے ہیں:

خوے آدم دارم، آدم زادہ ام
آشکارا دم زعصیاں میز نم

غالب کا انسان جتنا ذہن اور جسم کا تھا، اتنا اخلاق و اقدار کا نہ تھا۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ زندگی پر ان کی نظر کیا تھی اور کہاں تک تھی۔ زندگی سے جہاں تھاں جو نا آسودگی ان کے یہاں ملتی ہے، کیا عجب اس میں اس رجحان کو بھی دخل ہو۔ آسودگی اور ارتفاع تو

صرف اقدار و یقین کی زندگی میں میر آتا ہے۔

سنا جاتا ہے کہ عقل یا علم کی دیوی اشینہ یونان کے او لمپس نشین خدا زیوس کے سر سے دفعہ اجست کر کے برآمد ہو گئی تھی۔ اس کے بعد یہ نہ معلوم ہو سکا کہ زیوس کی عقل یا علم کتنا باقی رہ گیا تھا یا ایک خاتون کا بار اتر جانے سے زیوس نے کیا محسوس کیا۔ اس کا بھی پتا نہ لگ سکا کہ اس حادثے کے بعد زیوس او لمپس میں خانہ نشین ہو گئے تھے یا پہلے سے تھے۔ یہ بہت دنوں کی بات ہے۔ اب یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ علم و عقل ہی نہیں بلکہ شاعری کی دیوی دیویاں بھی ایسے لوگوں کے سر سے مستقل برآمد ہوتی رہتی ہیں جن کے لیے نہ تو زیوس ہونے کی شرط ہے نہ اشینہ کی۔ غالب کے زمانے میں نہ ایسے زیوس تھے نہ منروایا اشینہ بلکہ شاعری اور شخصیت دونوں کو ابھارنے، سدھارنے اور سنوارنے میں کافی ریاض کرنا پڑتا تھا۔ غالب کو خاص طور پر اس عمل سے گزرنا پڑا اس لیے کہ جیسی کاواک شاعری سے انہوں نے ابتدائی تھی اور کچھ دنوں اس میں اسیر رہے، اس سے بالکل مختلف نوعیت کی شاعری کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑا جس کا انہوں نے بڑی صاف دلی سے اعتراف کیا ہے۔ اس وقت کی دلی، تہذیبی و ثقافتی معاملات میں کسی آزاد روی یا بے راہ روی کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ حکومت کی ساکھ جتنی گرگئی تھی شفاقت کی اتنی ہی بڑھ گئی تھی۔ ہر عظیم تہذیب کے زوال میں یہ کرشمہ نظر آئے گا جو بڑا ہی سخت گیر ہوتا ہے۔ غالب کو ان حالات سے اپنے کو سازگار کرنا پڑا۔ ان کی جیسیں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے صورت حال کو پہچانا اور اپنی شاعرانہ صلاحیت کو وہ رنگ و رخ دیا اور ایسی کامیابی حاصل کی کہ ان کے او لیں اور سب سے مستند مورخ حالی کو لکھنا پڑا "ان کی شاعری اور انس پردازی نے ان کی لائف کو دار الخلافہ کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنادیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمه ہو گیا اور اردو نظم و نثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے۔"

غالب کی طفویلت اور عنقولانِ شباب کا زمانہ اگرہ میں گزر اجہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا لیکن اس کی وجہ سے ان کو زندگی کی کوئی سختی یا

محرومی جھیلنی نہیں پڑی۔ ان کی یتیمی پر بعض ابل نظر نے جن نفیاتی اصولوں کو سامنے رکھ کر اظہارِ خیال کیا ہے، ان اصولوں کے بجائے خود صحیح ہونے میں کلام نہیں لیکن ان کا غالب کے شعور پر اس طرح اثر انداز ہوتا کہ وہ احساسِ مکتوبی "زگستیت"، "خود بینی"، "خود نمائی" یادو سری نفیاتی ٹولید گیوں کے شکار ہو گئے، درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس زمانے میں شریف و آسودہ حال گھرانوں کے لڑکے تفریح و تعیش کے جس ماحول میں زندگی بسر کرتے تھے، اُس کا غالب کو بھی بہرہ وافر ملا تھا۔ اُس عہد کا ذکر غالب نے جس طرح کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے تلخ و ترش کا کیا ذکر، انہوں نے اعتدال سے زیادہ عیش کوشی میں حصہ لیا۔ مہر نیم روز میں انہوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ نعت میں ایک قصیدہ کہا ہے جس میں ابتدائی عہد کے عیش و طرب کی جھلکیاں ملتی ہیں:

آن بلبلم کہ در چمنستان بشا خار
ہر غنچہ از دلم بفصای شکفتگی
ہموارہ ذوق و مسی و لہو و سر و رو سوز
بنشم بجیب عشرتیاں میغشاند گل
وقت مراروانی کوثر در آستین
اس کے رد عمل کو یوں بیان کرتے ہیں:

اکنو منم کہ رنگ برویم نمی رسد
خود کرو نم بوشت شبہائے بیکسی
ڈرامائی اندازو اثر کے اعتبار سے غالب کے بے مثل اردو قطعے "اے تازہ وار داں بساط
ہواۓ دل" سے یہ نکڑا کتنا ملتا جلتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کنٹراست یا اختلاف احوال کی مصوری میں غالب کو موقع و موقعیت کو کام میں لانے پر کتنی غیر معمولی قدرت تھی۔ آگے چل کر کہتے ہیں: آہ ز عمر یکہ گذشت این چنین۔ یا یہ بیان کہ میں نے ایامِ دبستان نشینی میں شرح مایہ عامل تک پڑھا، بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فتح و فجور اور عیش و عشرت میں بتلا ہو گیا۔ ایسے یتیم کو اپنے یتیم ہونے کا احساس بمشکل ہو سکتا

ہے اور محض میتم ہونے کی بنا پر وہ کسی نفیاتی عارضے کا شکار نہیں ہو سکتا۔

غالب کو جس نے غالب بنایا وہ آگرہ نہیں، دہلی ہے۔ اس وقت کی دلی میں افراد اور ادارے تہذیب کا درجہ رکھتے تھے۔ یہاں آنے کے بعد ان کو جن مرحلوں سے جس طرح گزرنا پڑا، وہی ان کی سیرت و شخصیت کے بنانے میں مستقل طور پر معین ہوئے۔ گواں عمل میں قلم سرنوشت کے ٹیز ہے یا سیدھے قط لگنے کو بھی کچھ کم دخل نہیں ہوتا۔ دہلی میں ان کی شادی کمنی، ہی میں ایک شریف اور کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی۔ ازدواجی زندگی راس آئی ہو یا نہیں، دہلی میں ان کی شاعری نے صحیح سمت و سطح پائی۔ آگرہ میں ان کی زندگی جن بے عنوانیوں میں گزری تھی، ان کی بہت کچھ اصلاح دہلی میں ہو گئی۔ آگرہ میں نہ ایسے شخص تھے نہ ادارے جو غالب کی چینیں کو پہچانتے اور اس کو تربیت دے سکتے۔ یہ زمانہ دہلی کے تہذیبی عروج اور سیاسی زوال کا تھا جو قوموں کی زندگی میں بڑا ہم ہوتا ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ گھنیں پر آڑنا
منزلِ یہی کنھن بے قوموں کی زندگی میں

غالب دہلی پہنچے تو اسے ایک عظیم تہذیب کے نمایندوں اور نمونوں کا معمورہ پایا جن کے فیض و فن سے اس کے بام و در منور تھے۔ ان میں سب سے زیادہ و قوت قلعہ معلانی اور اس کی ان گر انمایہ روایات کی تھی جو اس کے سب سے زیادہ بے دست و پاؤ قابلِ رحم حکمراء کے منصب کو حاصل تھی۔ مشائخ میں شاہ غلام علی، مولانا احمد فخر الدین، حضرت سید احمد، مولانا محمد فخر الدین۔ حکما میں حکیم احسن اللہ خاں، حکیم صادق علی خاں، حکیم حسن محمد خاں، حکیم غلام نجف خاں۔ علمائے دین میں شاہ عبدالعزیز، مولانا محمد صدر الدین خاں، مولانا فضل حق، شاہ رفع الدین، مولانا محمد اسماعیل، مولانا نذیر حسین۔ شعراء میں نواب محمد ضیاء الدین احمد خاں رخشان و نیر، میر نظام الدین ممنون، شاہ نصیر، ذوق، عارف، مومن، صہبائی، شیفتہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ کتنی درگائیں، آستانے اور سجادے تھے۔ ان کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا کہ یہ اشخاص اور ادارے دلی کے مخصوص و گر انقدر معیارِ اخلاق و اقدار

کے نگراں و نگہبان تھے اور اپنی اپنی جگہ پر سوسائٹی کے وزن و وقار کو اس سے کہیں زیادہ قوت و اعتماد کے ساتھ سنبھالے ہوئے تھے جو آج کل کے اعلاء سے اعلا علمی تعلیمی، مذہبی اداروں، طرح طرح کی تہذیبی انجمنوں، علمی مذاکروں، اخبار و رسائل، ایوان ہائے حکومت، حتیٰ کہ پولیس سے بھی نہیں بن پڑتے۔ یہ ضرور ہے کہ اس وقت کی دہلی کے مقابلہ آج کل کی دہلی کہیں زیادہ بے کراں و بے امال ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہر عہد کی طرح یہ عہد بھی اپنے طوفانوں کے ساتھ اپنے الیاس و خضر کیوں نہیں لاتا۔

مغرب کی ہوائیں اپنے ساتھ سامنے، صنعت، مکانالو جی، حکمرانی اور حکم برداری کے نئے نئے تصورات لاائیں۔ مذہب و اخلاق کے صحیفوں کی نئے سرے سے ورق گردانی کی جانے لگی۔ نئی صداقتیں نئے چیلنج لائیں۔ نئی آرزوؤں نے انسان و انسانیت کے فروع کے لیے نئی شمعیں روشن کیں اور نئے افق دریافت کیے۔ احیاۓ علوم اور اصلاح دین کی تحریکوں نے مغرب کو جو ولہ تازہ دیا تھا جس سے وہ دنیا کا معلم جدید قرار پایا، اس کی حرکت و حرارت ہندستان تک پہنچی۔ شاہ ولی اللہ سے سر سید تک مذہب و معاشرت کے تصور میں جو تبدیلیاں رہیں، وہ آزادی افکار کی انہی گیتی نور د تحریکوں کا پرتو ہیں۔ انگریزی حکومت نے افراد اور جماعت کو جان مال و آبرو کے تحفظ و ترقی کی ضمانت دی جن سے وہ مدتیں سے محروم تھے۔ اس کے ساتھ مغربی اداروں، مغربی فکر و عمل اور مغربی لظم و نق سے ہندستان کو روشناس کرایا انگریزی عمل دخل نے جہاں ہندستان کو بہت سی خام خیالیوں سے نجات دلائی، وہاں اس کی خام پیداوار اور براءے نام مزدوری سے اپنے ملک کے کار و بار کو اس طرح فروع دیا کہ صنعتی انقلاب اپنی اہمیت کے اعتبار سے اصلاح دین اور احیاۓ علوم کی تحریکوں سے کمتر نہ رہا، بلکہ یہاں تک کہنا صحیح ہو گا کہ یہ تینوں تحریکیں ایک دوسرے کی معاون ہی نہیں ایک دوسرے کا منطقی نتیجہ ہیں۔

اس زمانے میں جتنے چھوٹے بڑے انگریز حکام ہندستان آتے تھے، ان میں بیشتر نہ صرف انگریز حکومت میں پورا درک رکھتے تھے بلکہ صاحب علم و فن بھی ہوتے بالخصوص علومِ مشرقیہ میں۔ وہ جتنے حاکم ہوتے اس سے کم عالم نہ ہوتے۔ انگلستان کے اکابر اس سے

واقف تھے کہ ان کو ہندستان کی بد نظمی ہی کو نہیں دیکھنا تھا بلکہ وہاں کے اکابرِ علم و فن کا بھی سامنا کرنا تھا۔ اعلاً علمی سطح پر قدیم و جدید کو ایک دوسرے سے متعارف کرنے میں اس عہد کے علم دوست انگریز حکام کا ہندستان پر بڑا احسان ہے۔ غالب کا ان سے کسی نہ کسی سطح پر ساتھ رہا۔ غالب سے پہلے اردو شاعروں کے سامنے فارسی شاعری کی اتنی روح نہ تھی جتنی اس کی روایت اور رواج اردو شعر افشاری شاعری کی ٹیکنیک اور درویش سے بخوبی واقف تھے۔ اس کو صحت و صفائی سے برتبے اور اس پر اصرار کرتے۔ دہلی میں غالب کو خاندانی املاک اور وراثت کے جھگڑوں کا سامنا ہوا۔ پیش کا استغاثہ لے کر لکھنؤ، کانپور، اللہ آباد ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ اس سفر میں جہاں تک لکھنؤ جانے کا تعلق تھا۔ ”کشش کافر کرم“ کا بھی شاہبہ تھا۔ کلکتہ میں انگریزی اور ایرانی اربابِ علم سے تعارف ہوا۔ جنھوں نے اپنی وسعتِ نظر، علم و فن میں دستگاہ اور معارف پروری سے غالب کو متاثر کیا ہو گا۔ وہاں کے مشاعروں میں غالب کو اس آدیزش سے سابقہ ہوا جوزبان: ال اور اہل زبان میں ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ فارسی کے ہندی نثر ادھر مندوں کے ”غوغائے شکونے“ کی زد میں آگئے۔ مخالفوں نے ان کو قواعد اور لغت کے چرخ پر رکھ لیا۔ یہ کہتے تھے کہ بتوں کی طرح زبان بھی ہزار شیوه ہوتی ہے جس کو اب تک کوئی نام نہیں دیا جاسکا ہے۔ چنانچہ اس عہد کے کلکتہ میں ان کو نقد و نظر کے مسائل میں وہی پیش آیا جو آج کل کے کلکتہ کے لکھم و نسق میں حکومتِ وقت کو پیش آتا رہتا ہے۔ کلکتہ میں غالب کے مخالف اور موید دونوں تھے۔ کچھ دنوں مقابلہ کرتے رہے، بالآخر کنارہ کش ہو جانے میں مصلحت دیکھی۔ معذرت میں مشتوی بادی مخالف لکھی۔ فریقین ختم ہو گئے لیکن ایک بڑے شاعر کا نیج و تاب، درود و درماندگی، راست گوئی اور معذرت خواہی اس کے کارناموں میں کس طرح زندہ رہتی ہے، اس کی مثال یہ مشتوی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے سخن پرور ان کلکتہ وے زبان آور ان کلکتہ
اے ریسان ایس سوادِ عظیم وے فراہم شدہ زہفتِ اقلیم
اسد اللہ بخت برگشتہ در خم و پیع محز سرگشته

گرچہ ناخواندہ میہمان شماست
 ذوقِ شعر و سخن کجاست مرا
 گردشِ روزگارِ خویشتم
 بر غربیاں کجا روایتِ ستم
 دامنِ ازکفِ کنم چکونہ رہا
 خاصہ روح و روانِ معنی را
 آنکہ طے کردہ اس موافق را
 دل و جانم فدائے احباب است
 میشوم خویش رابہ صلح دلیل
 گرچہ ایرانیش نخواهم گفت
 لیکن از من هزار بار بہ است
 من کفِ خاک واو سپهر بلند
 مر جبا سازِ خوش بیانی لو
 نظمش آبِ حیات راماند
 نثر او نقشِ بال طاؤس است

بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست
 کے زبانِ سخن سراستِ مرا
 حیرت کاروبارِ خویشتم
 رحم اگر نیست خود چراستِ ستم
 طالبِ عرفی و نظری را
 آن ظہوری جہاں معنی را
 چہ شناسد قتیل و واقف را
 شوق، وقفِ رضاۓ احباب است
 می سرایم نواے مدحِ قتیل
 سعدی شانیش نخواهم گفت
 از من و پیغمون ہزار بہ است
 خاکِ پاکے رسید پھرخ کمند
 جذرا شورِ نکته دانی او
 در روانی فراتِ راماند
 انتخابِ صراح و قاموس است

آخر میں کہتے ہیں:

رحم برم او بے گناہی ما!

اس آشتی نامے پر جھگڑا ختم ہو گیا۔ غالب نے معدرت تو کر لی لیکن اپنا موقف نہیں بدلا۔ چنانچہ مشنوی میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ اس چیلنج سے کم اشتعال انگیز نہیں ہے جس سے مناقشے کی ابتداء ہوئی ہو گی۔ تقریباً چالیس سال بعد مرزا نے قاطع بُرهان لکھی جس میں بُرهان قاطع پر گرفت کی گئی تھی۔ اس پر بھی فتنہ برپا ہوا۔ خیال یہ ہے کہ غالب جیسے غیر معمولی تخلیقی تaur کو تحقیق کے میدان میں نہیں اترنا چاہیے تھا۔ لغت، الفاظ، محاورہ وغیرہ کی وادی شاعری کی جولانگاہ سے مختلف ہے۔ لغت میں خیل کام نہیں دیتی، تفییش درکار

ہوتی ہے۔ لغت نویس بڑی چھان میں، مختلف و متعدد لغات علم زبان کے اصولوں اور الفاظ کے عہد بعہد تبدیلیوں کو سامنے رکھ کر حکم لگاتا ہے۔ اس نوعیت کے مسائل میں اہل زبان ہونا اتنا کام نہیں دیتا جتنا زبان کا محقق و مبصر ہونا۔ خیال تو یہاں تک ہے کہ اگر لغت کے معاملے میں زبان داں نہیں اہل زبان کو اختیارات دے دیے جائیں تو زبان و ادب میں آئے دن انتشار و خلفشار کا سامنا ہونے لگے۔ لغت کے کالمین اکثر و پیشتر غیر اہل زبان ہوتے ہیں۔ عدایہ کو انتظامیہ یعنی جوڈیشری کو ایگزیکٹو سے علاحدہ رکھنے میں اسی طرح کی کچھ مصلحت رکھی گئی ہے۔

غالب کا کلکتہ کا سفر پیش کی بازیافت میں راس نہ آیا لیکن وہاں ان کو دخانی کشمیوں "سبزہ زارِ مطرا" "ناز نیں بتانِ خود آرا" میوہ ہائے تازہ و شیریں" اور "بادہ ہائے ناب و گوارا" سے آشنا ہونے کا موقع ملا جس سے وہ بہت مسرورو متأثر ہوئے۔ اس زمانے میں انگریز اور انگریزی حکومت کے دو بڑے اہم مرکز کلکتہ اور دہلی تھے۔ غالب کا ان سے براہ راست سابقہ رہا۔ اس وقت تک غالباً کسی دوسرے معروف اردو شاعر نے غالب کی طرح دور دراز اہم مقامات کا سفر نہیں کیا تھا اور زندگی و زمانہ کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ سر سید نے آئین اکبری کو مدد و نیکی کیا تو غالب سے تقریظ لکھنے کی فرمایش کی جسے موخر الذکر نے اس فہمائیش کے ساتھ پورا کیا۔ "مردہ پروردن مبارک کار نیست" کہتے ہیں:

کس مخز باشد بگیتی ایں متاع	خواجہ راچہ بود امید انتقام
صاحبان انگلستان رانگر	شیوه و انداز اینان رانگر
تاچہ آئینہا پدید آورده اند	انچہ ہر گز کس ندید، آورده اند
داد و دانش را بھم پیوستہ اند	ہند راصد گونہ آئین بستہ اند
از دخان، زور قب رفتار آمدہ	باد و موج ایں ہر دو بے کار آمدہ
لغہ ہائے زخمہ از ساز آورند	حرف چوں طائر بے پرواز آورند

غالب کی شخصیت کو سمجھنے میں سہولت ہو گی اگر ہم تعصباً یا خوش عقیدگی سے

علاحدہ اور بلند ہو کر ان کی ذہنی پرداخت کا جائزہ لیں۔ ان کو اپنے نسب پر بڑا فخر تھا جس کا برابر اظہار و اعلان کرتے رہتے تھے لیکن زمانہ سازگار نہ ہوا۔ باوجود کوشش کے دہلی میں اس معیار زندگی تک نہ پہنچ پائے جس کا دہلی کے اکابر کے ساتھ وہ اپنے کو مستحق سمجھتے تھے۔ یہ محرومی ان کی سیرت و شاعری پر اثر انداز ہوئی، سیرت پر زیادہ شاعری پر کم۔ ان کی شاعری میں وہی تب و تاب اور فکر و فرزانگی ملتی ہے جو کلاسیکی شاعروں کا امتیاز ہے لیکن یہ بات ان کی سیرت و شخصیت کے بارے میں وثوق سے نہیں کہی جاسکتی جس میں وہ صداقت نہیں ملتی جو پہبد و پہنگر کی اولین صفت ہے اور جسے غالباً اپنا سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپناراستہ علاحدہ نکالا۔ جیسیں یوں بھی روشن عام سے ہمیشہ علاحدہ رہی ہے۔ غالباً کے غیر معمولی جیسیں ہونے میں کلام نہیں۔ اس طرح ان کا علاحدگی کا رجحان بھی معمول سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ ایک جگہ تو یہاں تک کہہ گئے ہیں:

فرسودہ رسماہے عزیزان فرو گزار
در سور نوحہ خوان و بزم عزا بر قص

غالب طبعاً عجمی تھے، مسلمان، موحد، صوفی سب بعد میں۔ انہوں نے حمد، نعمت و منقبت میں عقیدت کے جوہد یے پیش کیے ہیں ان سے انکار نہیں لیکن ان کی شخصیت کا یہ پہلو جتنا انتیاد و طاعت کا ہے، اتنا فکر و تخيّل کی بلندی و برناٹی اور عرفان و یقین کا نہیں ہے۔ وہ شاعر اور شخص دونوں اعتبار سے عجمی ہیں۔ عجم کے یزدان واہر من، لہرا سپ و جامسپ، جام و جمشید، آتش کدوں اور لالہ زاروں اور ان سب کے رسم و روایات کی رو سے۔ اس کا سراغ ان کے اردو کلام یا خطوط میں اتنا نہیں جتنا فارسی کلام میں ملتا ہے۔ غالباً کے عجمی نہاد ہونے کی تائید میں ان کے اعترافات ملاحظہ ہوں:

بود غالب عند لپے از گلستان عجم من ز غفلت طویی ہندستان نامید مش
غالب زہند نیست نوابے کے کشم گوئی زاصہبان وہرات و قمیم ما
در من ہوس بادہ طبیعتیت کے غالب پیانہ بہ جمشید رساند نبم را
ناداں حریف مستی غالب پیالہ جمشید بوده است

لہر اسپ کجا رفتی و پرویز کجای آتش کدہ ویرانہ و میخانہ خرابست
ساقی نامہ کے دواشمار سئیے:

بیاساقي آئینِ جم تازہ کن طرازِ بساطِ کرم تازہ کن
بہ پرویز ازے درودی فرست بہ بہرام ازے سرودی فرست
کہتے ہیں:

رموزِ دیں تشناسم، درست و معدود رم
نهادِ من بجمی و طریق من عربیت

غالب کے کلام میں آتشِ نفسی کی جو ایک زیریں لے ملتی ہے، وہ بھی آتشکده
ایران کا تصرف ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

دلم معبد زردشتست غالب فاش میگویم
بہ خس یعنی قلم من داده ام آذر فشانی را

ساز و قدح و نفہ و صہبا ہمہ آتش یا بی زمندر رہ بزم طر بم را
شرارِ آتشِ زردست در نہاد م بود کہ ہم بداغِ مغان شیوه دلبر انم سوخت
از آتشِ لہر اسپ نشاں میدید امروز سوزے کہ بخا کم ز تو در عظیمِ ریسم است
عمر ہا چرخ بگر دو کہ جگر سونتہ چوں من از دودہ آذر نفساں برخیزد
سینہ بکشودیم و خلقتے دید کا نجا آتش است

بعد از اس گویند آتش را کہ گویا آتش است

اُردو میں بھی اس سوزِ دروں کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں لیکن نسبتاً کم۔ غالباً
اپنے فارسی نژاد اور بجمی نہاد ہونے کا اظہار جس کثرت اور جس واضح طریق پر اپنے فارسی
کلام میں کرتے ہیں، اُردو میں نہیں کرتے۔ اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ اُردو میں وہ اُس
مسلک، اُس فضا، شعری روایات اور معاشری مقتضیات کا لحاظ کرتے ہوں جو دہلی میں
مقبول تھے لیکن فارسی میں ان کا ذہن قدیم ایران کی طرف بے اختیار منتقل ہو جاتا تھا۔
ایک خیال یہ بھی ہے کہ دہلی میں زندگی اور زمانے کو اپنے معیار یا اپنے مقاصد کے مطابق

نہ پا کر انہوں نے عجم میں پناہی ہو۔

ان وجوہ سے میں غالب کے فارسی کلام کو جس میں غزل، قصیدہ، مشنوی سب شامل ہیں، بحیثیت مجموعی اردو کلام سے زیادہ ان کا نمایندہ سمجھتا ہوں۔ اس سے یہ کہنا مقصود نہیں ہے کہ غالب کا اردو کلام ان کے فارسی کلام کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب کی جو مؤنثت ہے اور جس عالمگیر پیانا نے پر آج اس کا اعتراف کیا جا رہا ہے وہ تمام تر ان کی اعلاء اور دو شاعری کی بنابر ہے۔ اپنے اردو کلام کا اعتراف خود غالب نے کیا ہے اور اسی ادعائے کے ساتھ جس سے کسی وقت انہوں نے اپنے مجموعہ اردو کو "بے رنگ من است" بتایا تھا۔ کلام کو نمایندہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے اعتقاد و افکار اور ذہن ذوق کی جو ترجمانی اور زور بیان و روایتی طبع کے جیسے نمونے ان کے فارسی کلام میں ملتے ہیں وہ ان کے اردو کلام میں کم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک انسان و کائنات کے روابط و رموز تک رسائی اور ان کی بے مثل باز آفرینی کا تعلق ہے، غالب کا شمار دنیا کے منتخب شاعروں میں ہو گا لیکن اکثر دنیوی امور میں ان کے بیانات اور طرزِ عمل کو عقیدت کے سایے میں نہیں، عقل کی روشنی میں پر کھنا بہتر ہو گا۔ باہمیہ ان کے وسیع المشرب اور انسان دوست ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کے کلام میں ان کے یا کسی اور عہد کی تصویر یا ترجمانی ملتی ہے۔ اس طرح کی ذمہ داری غزل نہ پسند کرتی ہے نہ قبول۔ وہ نہ اخبار ہوتی ہے نہ تاریخ یا تذکرہ۔ اس میں باطن کے احوال کی مصوری ملتی ہے جن کو اچھا شاعر اپنی شخصیت میں ڈھال کر اس اداے خاص سے پیش کرتا ہے کہ سامع کو وہ اپنے احوال معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہی شاعر کا کمال اور اس کی شاعری کا اعجاز ہے۔ اچھی غزل وہ ہے جس کے بیشتر اشعار حسنِ خیال، حسنِ معانی اور حسن بیان کے اعتبار سے ضرب المثل بن جائیں یا بن جانے کی ان میں صلاحیت ہو۔ سہلِ ممتنع کا ایک تصور یہ بھی ہے۔ اسی معیار کو پیش نظر رکھ کر میں نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ ایک دلچسپ خیال اکثر آتا رہتا ہے کہ اگر ہندستان کی دوسری زبانیں اپنی اپنی جیہیں، روش و روایت کو مدد

نظر رکھتے ہوئے غزل کو اپنائیں تو ان زبانوں کے حق میں کیا ہو گا۔ کیا غزل ان زبانوں میں اپنی کم سے کم خصوصیات کو بحال رکھ کر ان کے محسن اور قبولی عام میں کوئی اضافہ کر سکے گی۔ یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ عام ذہنوں پر اردو کی جیسی غیر معمولی گرفت ہے، اس میں غزل کا سب سے گراں قدر حصہ ہے۔ اس لیے ہندستان کی دوسری زبانوں بالخصوص ہندی کو چاہیے کہ وہ غزل کو اپانے میں چکچائے نہیں بلکہ ہمت اور ہنر مندی سے کام لے۔

اس میں شک نہیں اگر غالب نے اردو میں شاعری نہ کی ہوتی تو شاید ہم اس احترام و عقیدت کے ساتھ ان کی فارسی شاعری کی طرف متوجہ نہ ہوتے جتنے کہ ہوئے۔ غالب اور اقبال نے اردو کو فارسی سے اس طرح ہم آہنگ کیا اور ربط دیا ہے کہ اردو میں جب کوئی بڑا شاعر کسی بڑے موضوع پر سوچنے اور کہنے کے لیے آمادہ ہو گا تو اس کو تو اتنای زیبائی اور اثر آفرینی کے لیے فارسی کے نوع بہ نوع ذخائر سے استفادہ کرنا پڑے گا۔ عظیم زبانوں کے کاروائی کے ساتھ اردو شعر و ادب اب تاخ اور انشا کے بنائے ہوئے پالنے یا پاکی میں نہیں بلکہ غالب اور اقبال کی قیادت و رفاقت میں سرگرم سفر ہو گا۔

کلکتے تے واپسی پر بقیہ تمام عمر دہلی میں بسر ہوئی۔ زندگی کے طرح طرح کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ فراز سے کم نشیب سے زیادہ بہت زیادہ۔ قمار بازی کی پاداش میں قید خانے جانے کا حادثہ بڑا سخت تھا۔ اس وقت کی دہلی کی اشراف سوسائٹی میں اس طرح کی لغزش ناقابلِ معافی تھی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اس موقع پر غالب کی جس طرح دست گیری اور غم خواری کی، وہ طبقہ اشراف (ارسٹوکرنسی) کی روایتی جرات فیاضی اور وضع داری کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ غالب نے جس خلوس اور شاعرانہ خوب صورتی سے اس ایک شعر میں شیفتہ سرائی کی ہے اس نے اسے ضرب المثل بنادیا ہے۔ ایسی ضرب المثل جس کو صرف اہل ذوق بر محلِ معرضِ گفتار میں لا سکتے ہیں:

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غم خوارِ من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ، عزادارِ من است

یوں بھی غالب کو شیفہ سے جوارادت تھی وہ کم اور لوگوں سے تھی۔ خاندانی مناقشے اقرباً کی، بے اعتنائی، عزیزوں کی وفات، آمدنی حد سے زیادہ محدود کبھی مسدود، قرض کی گرانباری، غرض وہ تمام بلا میں جو خانہ انوری کی تلاش میں آسمان سے مصر عوں میں نکلتی تھیں، خانہ غالب پر مشاعرہ بن کر نازل ہوتی رہیں اور غالب کا یہ کہنا غلط نہیں معلوم ہوتا کہ اگر ستمبائے عزیزاں کی شرح کروں تو جہاں سے رسمِ امید اٹھ جائے۔ زندگی گزرتی رہی، راہ گزر یاد آتا رہا۔ اس ڈرامے میں جا بجا غالب کا پارٹ بھی قابل تحسین نہیں تھا لیکن آلام کی اس یورش میں غالب نے جتنے اچھے شعر کہے اور بے مثل خطوط لکھے ان کے مقابلے میں اگر ان کے اعمال کے کچھ مصرعِ تقطیع سے گرتے ہوں تو اس سے ان کو کافر نہیں صرف گناہ گار سمجھنا چاہیے۔ رفتہ رفتہ قلعے سے توسل ہوا، مشاعروں میں شرکت ہونے لگی، صریر خامہ صدائے سروش یا صدائے سروش صریر خامہ میں ڈھلتی رہی۔

اسی زمانے میں غالب نے اردو خطوط لکھنے شروع کیے جن کی اہمیت غالب کے شعری تاثر فکر سے کم نہیں۔ دل کے معاملے میں غالب کو ان کے اشعار کے انتخاب نے رسوایکیا ہو یا نہیں، ان کے رقعات نے یقیناً ان کو محبوب خلائق بنادیا۔ ان کی شاعری میں فکر و تخيیل بیدار ہے تو ان کے خطوط میں زندگی اور شخصیت کا حسن اور حرکت ہے۔ فارسی اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے شعروادب میں بھی یہ صنف عام رہی ہے اس فرق کے ساتھ کہ دوسری زبانوں میں غالباً خطوط کو وہ اہمیت نہیں دی گئی تھی وہ اتنے متنوع ہیں جتنے کہ غالب کے خطوط۔ مجھے خطوط نگاری کی تاریخ سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ بچپن میں انشاء مادھورام، جوانی میں لیڈی چڑی کے عاشق کے خطوط اور بڑھاپے میں مولانا ابوالکلام آزاد۔ کہ مکاتیب نظر سے گزرے، ممکن ہے اسی کارڈ عمل ہو جس کی وجہ سے اسیر اصرار ہے کہ میرے خطوط خواہ کسی کے نام ہوں، شائع نہ کیے جائیں۔

مندستان میں فارسی خطوط بالعموم اتنے خطوط نہیں ہوتے تھے جتنا ان میں تصنیع و تکلف کی نمائیں اور الفاظ و عبارت کا اسراف ملتا تھا۔ فارسی نثر میں بالخصوص ترصیع

و جکلف کے جتنے پناہ گزیں (رفیو جی) ملتے ہیں، شاید ہی کسی اور زبان میں نظر آئیں۔ فارسی کا یہ تصرف اردو پر رہا۔ عبارت کے تکلفات، ہی کا نہیں اسالیب کے تنوع کا بھی۔ یہ اسی کا فیضان ہے کہ ہندستان میں اردو جیسی کثیر الاصناف زبان شاید کوئی دوسری نہ ہو۔ اس میں رقعاتِ غالب کو اردو نثر کے بنیادی اسالیب میں سے ایک نمونہ قرار دینا غلط نہ ہو گا۔ خطوط کونہ پکا گانا ہونا چاہیے، نہ فلمی، نہ قوالی۔ خط لکھنا دراصل اتنا خطبہ صدارتِ تصنیف کرنے کا فن نہیں ہے جتنا گفتگو کرنے کا سلیقہ ہے اور گفتگو کرنے گفتگو، ہی کرنے کا نہیں، خاموش رہنے کا بھی فن ہے۔ اس اعتبار سے بڑا سخت کیر فن ہے۔ خاموش رہنا صفاتِ الہیہ میں سے ہے۔ اپنے بے پایا اور بے کراں اختیارات میں تنہا بیٹھنا خدا ہی کے بس کی بات ہے۔

خطوط نویسی کو میں فنونِ لطیفہ میں جگہ دیتا ہوں لیکن اردو میں اس کی مثال صرف غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ حسن و ہنر کا جواہر و ابلاغ مختلف فنونِ لطیفہ سے علاحدہ علاحدہ ہوتا ہے، گفتگو کرنے میں ان سب سے بطریقِ احسن کام لینا پڑتا ہے۔ اچھی گفتگو کرنے والے کی گفتگو میں نقش، رنگ، رقص، آہنگ اور شخصیت کی بیک وقت جلوہ گری ملتی ہے۔ شخص کی عدم موجودگی میں یہی کرشمہ اس کے خطوط میں نظر آئے گا۔ غالب نے جو کہا ہے کہ میں نے مراسلے کو مرکالمہ بنادیا ہے، اسی رمز کی وضاحت ہے۔ ان امور کے پیش نظر غالب کے خطوط کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ تصنیف اور مصنف میں کتنی ہم آہنگی ہے۔

غالب کی شخصیت کا اظہار ان کے بے قلم خود نوشہ اعمال یعنی خطوط میں ملتا ہے۔ اس سے مختلف اس نامہ اعمال میں ملے گا جسے ان کے کاتبِ اعمال فرشتے نے مرتب کیا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ فرشتے کے لکھے ہوئے نامہ اعمال پر غالب کو آخرت میں سزا کا حکم سنادیا گیا ہو گا لیکن خطوط کے مطالعے اور اس کے صلے میں غالب کو عرشِ معلائی کے جوار میں کوئی محل ضرور الات کیا گیا ہو گا۔ اس طرح ان کی دیرینہ حرست تعمیر پوری کردی گئی ہو تو عجب نہیں۔ جنت میں قصر نہ دیے جانے کے بارے میں یوں شبہہ ہے کہ بہشت، رضویں اور حور و غلامیں کے بارے میں غالب نے اس دنیا میں وقت فو قتا جیسے خیالات

ظاہر کے تھے ان کے پر نفسِ نفس وہاں پہنچ جانے سے بحث کی ڈسپلن میں خلاں پڑنے کا قوی امکان تھا۔ اس طور پر جنت نیک روحوں کی آرامگاہ نہیں نوجوان طلبہ کی تعلیم گاہ یا آماجگاہ بن جاتی۔ غالب سنس آف ہیور (ذہانت اور خوش طبعی کا ملا جلا ملکہ) سے جتنے بھر پور تھے فرشتے اس سے اتنے ہی معصوم ہوتے ہیں اور سنس آف ہیور کی پوری داد صرف خدا یا اس کے بعض منتخب بندوں ہی سے مل سکتی ہے۔

خطوط نگاری کے رمز سے غالب بہت پہلے سے واقف تھے۔ اس کے آئین و اصول ایک مختصر فارسی رسالے میں مدون کر چکے تھے۔ البتہ یہ امر تعجب اور دلچسپی سے خالی نہیں کہ اردو خطوط کے لکھنے میں غالب زبان کی جو سادگی و سلاست ملحوظ رکھتے تھے، وہ ان کے فارسی خطوط میں کیوں نہیں ہے۔ غالب نے اردو میں جو تقریظیں لکھی ہیں وہ فارسی عربی الفاظ، عبارت اور ترکیبوں سے اس درجہ بوجمل ہو گئی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے، انہوں نے یہ فر سودہ روشن عام کیوں اختیار کی، جب وہ اپنے خطوط میں ایسی بے مثل اردو لکھ سکتے تھے۔ یہ بھی عجم کا فیض ہے کہ وہ فارسی کے تکلفات سے اپنے کو علاحدہ نہ کر سکے۔ شاید یہ بھی ایک سبب ہو کہ ظبوری کے سب سے بڑے عقیدت مندوں میں ہیں جس کا اعتراف انہوں نے فارسی غزاوں میں بڑی کثرت سے کیا ہے۔ ظبوری کے باش فارسی نثر کے جتنے تکلفات ملتے ہیں، وہ ان کے زمانے میں یقیناً مقبول تھے لیکن غالب اور ان کی جیئنیس اس سے مختلف تھیں۔ اس کا رد عمل وہ کیوں نہ ہوا جس نے سب سے زیادہ واقع غالب سے تھی۔

غالب کی کوئی اولاد نہ تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ گھریلو زندگی بھی خوشگوار نہ تھی۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

بامن میا ہیزائے پدر فرزند آزر رانگر
آنگلکس کے شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نہ کرد

کیا تعجب، جہاں تک صاحب نظر ہونے کا تعلق ہے پدر اور پسر بھی کے نہیں شوہر اور بیوی کے روابط بھی خوشگوار نہ رہتے ہوں۔ اعلانیسی کامنہ آئی۔ ہاکبر واقر باویے بھی ثابت ہوئے جیسا کے آلام واد بار میں اکثر ہو جایا کرتے ہیں۔ کتنی اور تائثہاں کا سامنا رہا جس کے ذمہ دار بھی یہ

خود ہوئے کبھی دوسرے، ان سب کام ادا اور تلافی غالب نے دوستوں اور شاگردوں سے محبت بڑھانے اور ان کی عقیدت و اعتبار حاصل کرنے میں ڈھونڈی اور پائی۔ اس طرح ان کی سیرت و شخصیت میں جو مردود و محبت آئی وہ ان تمام امتیازات سے زیادہ گرانمایہ تھی جو سوپشت سے آبا کے پیشہ سے پہلے گری میں بھی ان کے اسلاف کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔

انھوں نے اپنے کلام کی طرح اپنی پہلو دار شخصیت سے ہر طبقے اور ہر مسلک کے عزیزوں اور دوستوں سے اپنے کیسے کیسے دیرانے آباد کر لیے تھے۔ غالب کا ہر خط ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔ زندگی کی معمولی سے معمولی باتوں کو اکثر اس انداز سے پیش کیا ہے جیسے زندگی کے بڑے بڑے حقائق انھی معمولی باتوں کی کھلی چھپی یا بدلتی ہوئی شکل میں ہوں جن کو ہنسی خوشی انگیز کرنے اور کرتے رہنے میں انسان کی بڑی جیت ہے۔ خدا کی مشیت میں مفسر ہونے کے اعتبار سے ہر بات خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو وزن اور وقت رکھتی ہے۔ اس لیے اس کے سب سے بڑے شاہکار انسان کو توفیق دی گئی ہے کہ معمولی سے معمولی باتوں سے اچھی سے اچھی باتیں سیکھے اور سکھائے۔ اس طرح انسان کی سرت و آگہی میں اضافہ کرے۔ خدا نے انسان کو انبوہ میں نہیں بلکہ فرد افراد اپید اکیا اور اس دنیا میں بھیجا ہے تاکہ وہ پیغمبروں کی طرح اپنے فرائض کو خواہ وہ کتنے ہی معمولی درجے کے کیوں نہ ہوں خدا کی تاکید و تائید پر نظر رکھ کر بجالائے۔ بعثت پیغمبروں کی ہی نہیں ہوتی، ہر فرد کی ہوتی ہے۔ صرف فریضے اور میدان جد اہوتے ہیں۔

غالب اپنی اعلانیبی کے اعتبار سے اس وقت کی دہلی سوسائٹی میں جس مقام کا اپنے کو مستحق سمجھتے تھے، اس کے حصول میں ان کو ناکامی ضرور ہوئی لیکن اس کا اثر ان کی سیرت و شخصیت پر اچھا پڑا۔ وہ اشراف کے طبقے کے ہوتے ہوئے عوام کی تقدیر کی عبرت اور عظمت کے نمایندے ہو گئے۔ اگر وہ ثروت و اقتدار کے اعتبار سے دہلی کے اشراف و اکابر کے درجے پر پہنچ گئے ہوتے تو شاید ان کا تعلق عامته الناس سے اتنا عزیزاں مخلصانہ نہ ہوتا جتنا کہ ہوا۔ چنانچہ ان کے رقعات میں جوان کو عام لوگوں سے قریب تر کرنے میں سب سے زیادہ معین ہوئے، نسب کے نفاذ کی اتنی نہیں جتنی عامته الناس سے ہدمی کی فضال ملتی

ہے۔ وہ اپنے اشعار سے زیادہ اپنے خطوط میں ہم سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ اشعار میں وہ کبھی کبھی ہم سے دور بہت دور نظر آتے ہیں۔ خطوط میں نزدیک سے نزدیک تر۔ کبھی کبھی ہم ان خطوط سے جتنا مشاہر ہوتے ہیں، اتنا ان کے اشعار سے نہیں۔ ایسے خطوط جو اشعار یا انشائیں کے انداز میں لکھے جاتے ہیں وہ کتنے ناقابل برداشت ہوتے ہیں، اس کا اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ اشعار میں بالعموم حسن و عشق کی واردات، نفس و آفاق کے رموز فطرت کی نقاشی، زندگی و زمانہ کے نشیب فراز اور کبھی کبھی صرف الفاظ عبارت کی نمائش ملتی ہے۔ اچھے خط میں شخص و شخصیت کا انکشاف ایک دوسرے کی عزت و محبت کا اعتراف و اظہار اور اس میں شرکت کی دعوت ملے گی۔ دل کا معاملہ اشعار میں اتنا نہیں کھلتا جتنا خطوط میں۔ اس اعتبار سے غالب کے خطوط ان کے اشعار سے زیادہ گھر کے بھیدی ہیں۔

غالب کے اعلاء درجے کے شاعر ہونے میں کلام نہیں۔ وہ اور ان کے اسلاف اعلاء تہذیب روایات و اقدار کے حامل تھے۔ ان کا احساس رکھتے تھے اور اس کی ذمہ داری کو پہچانتے تھے۔ فطرت کی طرف سے ان کو غیر معمولی ذہن و ذوق ملا تھا۔ اپنے ذہن اور اپنے نسب دونوں کے اعتبار سے وہ حاضرین میں اپنی منزلت قائم رکھنے کے بیحد خواہش مند تھے۔ یہ خواہش بے جانہ تھی لیکن جیسا کہ اس طرح کے مقاصد و مسامی کا اکثر انجام ہوا کرتا ہے، وہ توقع کے مطابق پورے نہ ہوئے۔ اس مہم میں جتنی ناکامی ہوئی اتنی ہی وہ اپنی کوششوں کی سمت بدلتے اور رفتار بڑھاتے گئے۔ دوسروں کی بھلائی اور برتری کے کاموں میں اس طرح کی سرگرمی مفید و موثر ہوتی ہے اور بالآخر کامیاب ہوتی ہے لیکن اپنی بھلائی اور برتری پیش نظر ہو تو یہ طریق عمل بے سود ہی نہیں نقصان دہ بھی ہوتا ہے۔ غالب کو یہی پیش آیا۔ تفصیل میں جائے بغیر یہ کہنا بے محل نہ ہو گا کہ ذہنی تخلیقات کے اعتبار سے غالب کی جتنی شاندار شبیہ سامنے آتی ہے، ان کے شخصی کردار کے بعض پہلوؤں کے تصور سے نہیں آتی۔

ہم جس معيار سے کسی کی سیرت یا شخصیت کو پرکھنا چاہتے ہیں، وہ یا تو فرشتے کو سامنے رکھ کر وضع کرتے ہیں یا شیطان کو۔ حالانکہ تو ناپرکھنا مقصود ہوتا ہے انسان کو جو دونوں کا مرکب، اس لیے دونوں کے لیے وجہ جواز بھی ہوتا ہے۔ اگر غالب کے قبلہ یا قبلہ

نما عجم کے یزدان اور اہر من کو ذہن میں رکھیں تو اس دشواری و نزاکت کا اندازہ کر سکتے ہیں جو دونوں کو انسان کی تخلیق میں پیش آئی ہو گی یعنی انسان کی ترکیب میں یزدان اور اہر من اپنی اپنی نیابت یا تصرف کا تناسب کیا رکھیں۔ غالباً اس کا تصفیہ نصف نصف کے اصول پر ہوا ہو گا جو یزدان اور اہر من کا اتنا نتیجہ فکر نہیں معلوم ہو تا جتنا انسان کی خوش طبعی یا ستم ظریفی کا۔

غالب کی شخصیت اسی محور پر گردش کرتی ہے۔ وہ اپنے "آدم زادہ" ہونے پر فخر "دم ز عصیاں میز نم" کا اعلان اور "مے نوش و تکیہ بر کرم کر دگار کن" کی تلقین کرتے ہیں۔ زندگی کو اس طور پر آزمائے اور اس سے آسودہ و عہدہ بر آہونے کا حوصلہ ایک سلجوچ ترک ہی کر سکتا تھا جو مغلیہ تہذیب کا بڑا دل کش نمونہ بھی تھا۔ غالب کو غالب ہی کے رنگ میں دیکھنے اور پسند کرنے والے ایسے خیالات سے شاید ہی اتفاق کریں جہاں غالب کو ان اعمال عالیہ سے مخفف کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو خانقاہوں میں بھی خال خال ہی نظر آتے ہیں چہ جائیکہ خرابات میں جس سے غالب ہمیشہ نزدیک تر رہے۔ غالب طبقہ زباد سے نہ تھے، رندان قدح خوار میں تھے۔

وہ شاعر ہونے کے اعتبار سے بے مثل شخص کی حیثیت سے صلح پسند، عافیت جو، با مرقت، خیر منش، وضعدار، غیر معمولی حد تک ذہن، طبائع اور نفاست پسند تھے۔ خردوں، دوستوں اور شاگردوں پر جان چھڑ کتے تھے۔ ان کو سب کچھ دیدینا اور سکھادینا چاہتے تھے۔ دو ایک کے سوا ہندستان کے فارسی شعر اور اہل قلم کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اردو شعروادب میں بھی کسی کو اپنے قبیل یا قبیلے کا نہیں مانتے تھے۔ بعض دوستوں اور قدردانوں کا اخلاق قائم لیتے ہیں مگر اس طور پر کہ اپنے اعتراف نیازمندی کی آڑ میں اپنی فوقیت انہی پر نہیں، نکتہ سرایاں عجم پر بھی جاتے ہیں۔ یہ چند شعر ملاحظہ ہوں:

اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایاں عجم
چہ بما منت بسیار نہی از کم شان
ہند راخوش نفاسند خنور کہ بود

باد در خلوت شان مشک فشان ازدم شان
 مومن وغیر وصہبائی وعلوی دانگاہ
 حررتی اشرف و آزرده بود اعظم شان
 غالب سوخته جان گرچہ نیزد به شمار
 هست در بزم خن ہمنفس و ہدم شان

ہدمی کی خوبی اور تنہائی کا کیسا حزیں احساس و آہنگ ان اشعار میں ملتا ہے۔ مرا سوجھ بوجھ کے آدمی تھے، اپنے نفع و ضرر کو خوب سمجھتے تھے، اس کے مطابق عمل کرتے۔ کبھی کبھی وہ بھی کر ڈالتے جونہ کرتے تو اچھا کرتے، حکام اور رؤسائی خوشنودی حاصل کرنے اور ان سے نفع اٹھانے کے لیے تمام عمر کوشش رہے لیکن اس کے مطابق کامیابی نہ ہوتی۔ اس سلسلے میں ان کو جن ٹاساز گاریوں کا سامنا ہوا، اسے دیکھتے ہوئے ان کے شعر ن وادبی کارناموں کا اندازہ کریں تو معلوم ہو گا کہ خدا نے ان کو ٹاکامیوں سے کام لینے کا کیسا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا۔

آدمی کو جو نعمت فطرت سے نصیب ہوتی ہے، چاہتا ہے کہ اس کے مطابق سوسائٹی سے بھی ملے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ فطرت کی بخشش کسی اصول کے ماتحت نہیں ہوتی۔ جسے جو مل گیا مل گیا۔ دوسری طرف سوسائٹی کے ضوابط انسانی اور اجتماعی ہوتے ہیں۔ جب تک کوئی شخص اس کے مقررہ آمین و عبادت کو پورا نہیں کرتا، سوسائٹی اس کو لائق التفات نہیں سمجھتی لیکن کیا کچھے کہ جیسیں سوسائٹی کا کم ہی احترام کرتی ہے اور یہ سوسائٹی کی معنوں و ری耶 عالی نظری ہے کہ وہ جیسیں کا احترام کرتی ہے۔ غالب نے ولی ہونے میں اپنی بادہ خواری کو حاصل بتایا ہے، ممکن ہے کوئی اور بادہ خواری سے تائب ہو کر ولی ہو سکتا۔ سوال یہ ہے کہ باہ خواری سے تائب ہو کر غالب، غالب بھی رہ جاتے یا نہیں۔

ادب اور ادب کے باہمی روابط کیا ہیں، تنقید ادب میں پرانی بحث چلی آتی ہے۔ تنقید کا وہ دبستان جسے خارجی (Extrinsic) کہا جا سکتا ہے، نفیات، فلسفہ، اور معاشرہ کے دریچوں کی طرح حریم فن میں ادب کے سوانح اور سیرت کے دریچوں سے بھی داخل

ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کو گوئئے کا یہ قول نہ بھولنا چاہیے کہ گوئئے ہزاروں سور، بکری اور گائے بیل اور ہزاروں من انج سے مرکب نہیں ہے، جو اس نے اپنے دورانِ حیات میں ہضم کیے ہیں۔ انسانی ذہن (خاص طور پر فنکارانہ ذہن) ایک نہایت پُر پیچ دخم وادی ہے۔ اس میں سے جب محركات خارجی گزرتے ہیں تو وہ نہ صرف اپنی کیفیت بلکہ اپنی کیفیت کے اعتبار سے بھی بدل جاتے ہیں۔ کوئی بھی ادیب اپنے فن میں اپنی سیرت یا سوانح کو بے کم و کاست نہیں پیش کرتا۔ ڈرامائی ادب میں تو اسے اپنی شخصیت کو، وسروں کی "خود یوں" میں؛ حالانکہ اپنے البتہ لے رک اور غزل میں (جو غالب کافن ہے) کافی حد تک اس بات کی گنجائش ملتی ہے کہ فنکار اپنی "حر توں کا شمار" کر سکے۔ یہاں بھی ضروری نہیں کہ وہ جن اقدار عالیہ پر زور دے رہا ہے، اس پر عامل بھی رہا ہو۔ اگر فن کی یہ تعبیر صحیح ہے کہ اس میں حقائق کو عینیت کی عینک سے دیکھا جاتا ہے تو فنکار کے اکثر اقدار خیالی ہوتے ہیں۔ یا وہ ہوتے ہیں جن کو وہ حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن نہ کر سکا۔ غالب اپنے مسلک پر مستحکم رہتے ہیں یعنی

بخش دو گر خطا کرے کوئی

تو نواب شمس الدین خاں بہادر کے چھانسی دیے جانے پر خوشی کا اظہار نہ کرتے لیکن انسانیت کے اس نکتے کو بھی نظر اندازنا کرنا چاہیے کہ انسان کی بنیادی فطرت کا کبھی کبھی اس کے اخلاقی اقدار پر غلبہ پا جانا، تکلیف کی بات ضرور ہے تجھ کی نہیں۔

ادبی تنقید کے نقطہ نظر سے کسی ادیب اور شاعر کے سوانحِ زندگی کا صرف وہ حصہ لائقِ اعتمنا ہے جس کے بارے میں خارجی شواہد موجود ہوں یعنی اصل واقعائی محركات کیا تھے۔ ان واقعائی محركات کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہ جاتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فتنی تخلیق عام طور پر موڑ یا وقوعی ذہنی کیفیت کی تخلیق ہوتی ہے۔ غالب نے جس ڈومنی کو مار کھا تھا اور غالب جس کی وفات پر "ہائے ہائے" والی دردناک غزل لکھی ہے، ضروری نہیں کہ غالب کو اس سے والہانہ شیفتگی رہی ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ لمحاتی اعتبار سے غالب نے اس کی جدائی کی تڑپ کو محسوس کیا ہو گا۔ یوں بھی غالب کی پوری زندگی اور ان

کے کلام کو سامنے رکھیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ حسن، عقل، عشق، اخلاق اور زندگی اور موت کے اسرار و معارف سے جتنے آشنا تھے اور جس قدرت اور خوبصورتی سے کبھی ان پر سے نقاب اٹھاتے تھے یا ان پر نقاب ڈالتے تھے، اتنے وہ عورت یا جنس کی طرف مائل نہ تھے۔ ان کے بعد کے غزل گو شعر اس بارہ خاص میں غالب کی پیروی نہ کر سکے، شاید کہ بھی نہیں سکتے تھے۔ حالانکہ جیسے اعلا درجے کے غزل گو شعراء جس کثرت سے گزشتہ سانچھ ستر سال میں ہمارے سامنے آئے، وہ شاید ہی مستقبلِ قریب میں نظر آئیں۔

فن پارے سے فنکار کی سیرت و شخصیت کے نقوش کو جمع کرنا تنقیدِ ادب کا دلچسپ لیکن خطرناک یا گمراہ کن مشغله رہا ہے۔ یہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ فن شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ جہاں تک لیر ک LYRIC اور کسی حد تک غزل کا تعلق ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ فنکار کے واردات قلبی اس کی بصیرتوں مسرتوں اور محرومیوں کی اکثر غماز ہوتی ہے لیکن اس کا اطلاق بیانیہ یا ذرا امامی شاعری پر نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ ان اقسام کی شاعری میں شاعر کو بیشتر دوسروں کا قالب اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جمالیات کے نئے نظریے سے ثابت ہے کہ فن شخصیت کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس میں شخصیت پر قطع و ایزاد کا عمل بھی لازم آتا ہے۔ میں نے جو کہیں یہ بات کہی ہے کہ ایک نامعقول شخص معقول شاعر نہیں بن سکتا، اس کا مفہوم یہ ہے کہ فنکار کم سے کم اپنے تخلیقی لمحات میں کریم انفس اور معقول ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کی زندگی کے بیشتر لمحات کا تعلق لین دین کی اس دنیا سے ہوتا ہے جو اس کے ارد گرد پھیلی ہوتی ہے، اس لیے وہ عملی اور اخلاقی لحاظ سے اکثر و بیشتر نامعقول نظر آئے تو عجب نہیں۔ فن و شعر کی دنیا میں نامعقولیت کا گزر نہیں۔ یہاں نامعقول بات بھی حسنِ ادا سے کہی جاتی ہے، جیسا کہ غالب نے کہا ہے:

در عرضِ شوقِ حسنِ ادا بودن است شرط!

غالب کے شعری کارناموں کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے اور غزل کے بارے میں خیال ہے کہ یہ شخصیت کے اظہار کا وسیلہ کہی جاسکتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی تنقید نگار غزل کے چور دروازے سے غالب کی شخصیت و سیرت کے نقوش جمع کرنے کی

کو شش کرتا ہے تو اصولِ نقد کی رو سے درست اور بجا ہے۔ غالب کے تنقید نگار کو اس سلسلے میں یہ سہولت بھی حاصل ہے کہ وہ شخصیت و سیرت کے ان نقوش کو ان کے خطوط کے حوالے سے متحقق کر سکتا ہے۔ غالب کے خطوط اور ان کی غزاوں سے پتہ چلتا ہے کہ غالب ایک مخصوص انفرادیت کے حامل تھے۔ ان کو ”پاستگیِ رسم و رہ عام“ اور طرزِ جمہوری سے چڑھتی۔ خطوط اور غزاوں دونوں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کو زمانے کے ہاتھوں اپنی ناقد ری کا احساس تھا۔ اپنی نسبت سے ”عزم ایب گلشن نا آفریدہ“ کی ترکیب کا استعمال انہوں نے میں سال کی عمر سے پہلے ہی کیا تھا، ”شہرتِ شہر م بکیتی“ تو ادھیزِ عمر کی بات ہے۔

رندِ مشربی کے وہ عناصر جوان کے خطوط میں کافی ملتے ہیں، غزاوں میں بھی کماب نہیں۔ اپنے لیے ”رندِ شاہد باز“، ”دلی پوشیدہ اور کافر کھلا“ اس بات کی طرف واضح اشارے ہیں:

ع کعبہ مرے پچھے ہے کلیسا مرے آگے
ع ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ع کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں یا رب

وغیرہ، ان کے رندانہ نقطہ نظر کی واضح ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کی شہادت اشعار ہی سے نہیں مکاتیب سے بھی ملتی ہے جہاں وہ ہندو مسلمان اور عیسائی کی تفرقی کے خلاف بیک وقت قرآن، انجیل، اور چار ویدوں کی قسم کھاتے ہیں۔ غالب کی شخصیت کے چند اور پہلو جوان کی غزاوں سے نمایاں ہیں اور جن کی تصدیق خطوط سے بھی ہوتی ہے، ان کی انسانیت، دوستی اور کریم النفسی ہے، مثلاً:

ع بخش دو گر خطا کرے کوئی
ع کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
ع واقعہ سخت ہے اور جان عزیز
ع آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہوئا

ایسے بے شمار مصروع ہیں جن میں غالب کے مسلکِ انسانیت کے نقوش مل جائیں گے۔ غالب لذتِ گناہ سے آشنا تھے لیکن ان کو اپنی معصیت کا احساس توجہ اپنی سے رہا ہے۔ ابتدائی دور کے ایک قصیدہ منقبت میں کہتے ہیں:

جنس بازار معاصر اسد اللہ اسد

کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شراب ان کی گھٹٹی میں پڑی تھی جس کا آج غالب کی قلم اور تنقید و نوں میں بہت چرچا ہے۔ غالب کی سیرت و شخصیت پر اب تک جو قلمیں تیار کی گئی ہیں، ان سے بھی "غالب ناشناسی" کا ثبوت ملتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی اور سب سے معمولی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ غالب اپنی اعلانی اور غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کی بنابر اُس وقت کی دلی کے اعیان و اکابر میں شمار ہوتے تھے۔ شرفاءِ دہلی کا شیوه یہ نہ تھا کہ وہ کسی ذومنی کے ساتھ شراب میں بد مست منظر عام پر نظر آئیں۔ اس ذومنی کا غالب کی شخصیت، شاعری اور شیوه زندگی سے کوئی ربط نہ تھا۔ شراب میں سرشار ہو کر عورت سے بے ٹکف ہونا غالب کا مزاج نہ تھا۔ ان کا عیاش یا او باش PROFLIGATE ہونا کہیں سے ثابت نہیں۔ ان کی شاعری میں بھی عورت سے لمس و لذت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

عوام اور عوامی ہونے سے غالب جتنا دور تھے اور تمام عمر رہے، اسے غالب کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ عوام کی خاطر غالب کو مسح کرنا کسی قیمت پر گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ ان فلموں کا پلان اور پرداخت ذومنی اور شراب کے پس منظر میں نہیں بلکہ غالب کے کلام کے اعجاز و احترام کو ملحوظ رکھ کر کسی معتبر غالب شناس کی مگرانی میں ہونی چاہیے تھی۔ غالب اپنے شراب خوارنے تھے جتنے شراب کے اداشاں، ایسے اداشاں جس کی مثال اردو کے سوا شاید ہی کسی اور شعر و ادب میں ملتے۔ شراب نے غالب کو جتنا سوا کیا، غالب نے اسے اتنی ہی آبرو بخشی۔ شراب کو غالب نہ میر آتے تو اردو شاعری بعض کتنے زرخیز و زریں تصورات سے محروم رہ جاتی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، غالب کی میں نوشی کو ان کے کلام کی بے مثل رنگ و آہنگ میں دیکھنا چاہیے۔ مثلاً ان کے ان اشعار کی روشنی میں:

ع جانفرزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
ع گوہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تودم ہے
ع پھر دیکھیے اندازِ گل افشاںی گفتار وغیرہ

اس طرح غالب کے خطوط سے ان کی شخصیت کے "نقشبائے رنگ رنگ" لیے جانکتے ہیں۔ اس طرح کی فلموں پر حکم لگانے کا تعلق میرے اگلے وقت، آپ کے فی الوقت اور کسی اور کے ابن الوقت ہونے سے اتنا نہیں ہے جتنا صحیح اور صحت مند ذوق اور ظرف سے ہے۔ اور ذوق و ظرف ہمیشہ خواص کا "جورِ سُوكشن" (عدالتی اختیارِ سماعت) رہا ہے اور رہے گا۔ سیاست کو دین سے جدا کر دینے سے بڑی چنگیزی، معاشرے کو حیا اور حمیت سے بے گانہ کرنا اور رکھنا ہے۔

شراب اور عورت کے بارے میں چاہے جتنے امتیاعی احکام جاری اور نافذ کیے گئے ہوں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مصلحتِ الہی کو بہشت میں بھی ان کی رعایت رکھنی پڑی، خواہ ان دونوں کو کتنا ہی بے ضرر بنانا کر رکھا گیا ہو۔ بہشت میں شاعر کی گنجائیش رکھی گئی، یہ تو نہیں معلوم، لیکن جہاں شراب اور عورت ہو گی وہاں شاعر کا ظہور ہو کر رہے گا۔ فرق صرف ذوق اور ظرف کا ہو گا یعنی جیسی شراب اور عورت ہو گی ویسا ہی شاعر ہو گا۔ گفتگوِ ضمنی ہونے کے باوجود طویل ہو گئی جس کے لیے معدرت خواہ ہوں۔ موضوعات ایسے ہوں اور محفل ایسی ہو تو اس طرح کی لغزش ہو ہی جاتی ہے لیکن بہت کم لوگوں نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غالب شراب پینے کو معصیت خیال کرتے تھے، لیکن وہ اس معصیت کو مرتفع اور مکرم کرنا بھی جانتے تھے اور یہی غالب کا اشائیں تھا۔

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

انھوں نے اپنے احساسِ معصیت کا اسی طرح اظہار خطوط میں بھی کیا ہے اور کس خوبی سے اس کو حسنِ معصیت میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں وہ کہتے ہیں:

بہت سہی غم کیتی، شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقی کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے

اس غلام ساقی کو شکا طنطہ دیکھئے جو بالآخر کس طرح جام واٹگوں بن جاتا ہے۔

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے ہے گلفام بہت ہے

غالب نے اپنی غزلوں میں اپنی ذات کو اچھی طرح بے نقاب کیا ہے لیکن ان کی غزلیں محض شخصیت کا اظہار نہیں ہیں۔ وہ ان کی نا تمام حرتوں کا شمار بھی کرتی ہیں۔ وہ رند ہوتے ہوئے بھی خلعت و خطاب و جاہ کے طالب تھے۔ ان کو اپنی فتنی تخلیق سے تسلی نہیں ملتی تھی جب تک اس کی جلو میں صلد و ستائش نہ آئیں، ہر چند وہ اس سے انکار کرتے رہے غالب تمام عمر طالب رہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے طالب کا لفظ اپنے خطوط میں بارہا استعمال کیا ہے۔ غالب اور طالب کا ہم قافیہ ہونا ایک غیر متوقع ستم نظر اینگل بھی بو سکتی ہے لیکن یہ طالب کبھی بھی اپنے کو ”گداگر“ نہ بنا۔ کایہاں ان کی انا نیت مانع آتی تھی۔ فنِ شعر ان کے لیے گریز کا وسیلہ تھا یہ اور بات ہے کہ ان کا گریز اردو شاعری کی معراجِ کمال بن گیا ہے۔

فن دسیرت کے اس باہمی ربط کی روشنی میں غالب کی دو شخصیتیں سامنے آئیں گی، ایک یہ ت نگار کا غالب دوسرا اشعار کا غالب۔ سیرت نگاری میرا فرن، نہیں لیکن اشعار میں جس غالب سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے وہ نہایت خلائق، وسیع المشرب، صلح جو، نیک دل، وضعدار اور دانش مند غالب ہے۔ ان کے تصورات اور تخیلات نہ صرف حسین بلکہ جدید بھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک صدی گزر جانے کے بعد شہرت شعر غالب پر زوال نہیں آیا ہے۔ غالب کی انفرادیت پسندی اور انا نیت کے پس پر دہ بیسویں صدی کا مزاج روپوش تھا۔ غالب مجموعی طور پر وحدت الوجود کے دائرے سے نہ نکل سکے اور ”عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا“ کہتے رہے، تا ہم وارداتِ حسن و عشق کی فنکاری میں ان کی انفرادیت قدم قدم پر نمایاں ہے۔ ان کی شخصیت میں ایک پُر اسرار بے اطمینانی کے آثار نظر آتے ہیں جو بھی ان سے یہ کہلواتی ہے:

مانبود یم بدیر، مرتبہ راضی غالب

غالب کی خفیت

شعر خود خواہش آں کر دکے گردو فنِ ما!

اور کبھی زندگی کا یہ مردانہ تصور پیش کرتے ہیں:

مرد آں کر در بحومِ تمنا شود ہلاک

کبھی یہ:

اپنی نسبت ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگئی گر نہیں، غفلت ہی سہی

کہا جاتا ہے کہ انسانیت کا تصور شیطنت کے تصور سے جاملاً ہے اور ہر بڑے شاعر میں بقدرِ ذوق یا نظر ف ”یہ عظیم انحراف“ یا شیطنت ملتی ہے۔ اس عنصر کے بغیر ایک شخص اچھا شاعر تو بن سکتا ہے لیکن عظیم شاعر کی سرحد میں اکثر و بیشتر کافری کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ملیں گی۔ غالب کی عظمت میں اس کافری کا خاصاً داخل ملتا ہے۔ کبھی کبھی یہ لے اتنی بلند ہوتی ہے کہ غالب منصور سے بھی آگے نکلتے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں مثلاً:

آوازہ انا اسد اللہ درافتکنم!

”انا اسد اللہ“ کا یہ نعرہ اردو کے کسی شاعر نے نہیں لگایا ہے۔ یہ غالب کی انفرادیت کی آواز ہے، وہ انفرادیت جس نے غالب کو ”سلکِ جمہور“ سے دور اور خلاف رکھا اور وہ ایک ”اندازِ بیاں اور“ کی تخلیق کر سکے۔

عملی زندگی میں مذہب کی جانب غالب کا اجتہادی نقطہ نظر اتنا بھی نہ تھا جتنا مومن کا لیکن خیال کی دنیا میں پہنچ کر غالب ”ملتوں“ کو مٹا کر ”اجزائے ایماں“ بنادیتے ہیں اور ”لباسِ دین“ کو اس طرح ترک کر دیتے ہیں:

ز من حذرته کنی گر لباس دیں دارم
نہفتہ کافرم دبت در آستین دارم

” بت در آستین“ رکھنے والا یہ کافر مذہب کو ایک سعی پشمیں کا حاصل سمجھ کر کہتا ہے:

کافر نتوانی شد، ہاچار مسلمان شو

لیکن نعت اور مُحتَب میں جیسے بُر زور اور بُر شوکت قصیدے غالب نے تصنیف کیے ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر یا مسلمان ہونے میں غالب نے انتخاب کی آزادی کو پورے طور پر برداشت کی۔ خواہ وہ عقیدہ یا عقیدت محض روایتی ہو۔ پھر بھی غالب کے موحد ہونے اور ترک رسم کے کیش کے پابند ہونے کا ثبوت ان کے اردو اور فارسی کلام دونوں میں بار بار ملتا ہے۔ جنت کے محدود تصور کا انہوں نے جس تفسیری اور طنزیہ لجھے میں ذکر کیا ہے، وہ ضرب المثل بن چکا ہے۔ جنت کو دوزخ میں ڈال دینے کی جیسی جرات غالب نے دکھائی ہے، وہ اردو فارسی کے دوسرے شعراء کے ہاں شاید نہ ملے۔ فارسی کلام میں بھی انہوں نے ایک جگہ کہا ہے:

خلدر از نفسِ شعلہ فشاں میسوزم
تائدانند حریفان کہ سر کوے تو بود!

غالب کا کفر تنیج دین نہیں کرتا بلکہ اس کی ہمہ گیری کو ثابت کرتا ہے۔ زاہد شیخ اور محتب سے چھیڑ چھاڑ بیشتر شاعروں کے یہاں روایتی انداز میں ملتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ رنگ زیادہ واضح اور گہرا ہے۔ ان کی وسیع المشربی اور ملتوں کو مناکر اجزاء ایمان بنانے کا حوصلہ، ان کو اپنے مذہبی ماحول کی کشاکش میں بتلار کرتا ہے۔ عملی انسان نہ ہونے کے باعث انہوں نے اس سے خیال کی دنیا میں خوب خوب حساب پکالیا ہے۔ مثلاً:

جنت نکند چارہ افرادگی دل
تعمر باندازہ ویرانی مانیست

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدے
نشہ باندازہ خمار نہیں ہے
مبتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں
عمر عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

لaf دافش غلط و نفع عبادت معلوم
ذرو دیک ساگر غفلت ہے چہ دنیا وچہ دیں

غالب من و خدا کہ سر انعام بر شگال
غیر از شراب و لبیه و بر قاب وقت نیست

عمل اور خیال دونوں دنیاوں میں غالب نے زندگی کو گوارا بنا نے میں اُس حس لطیف سے کام لیا ہے جس کی بنا پر حالی نے ان کو حیوانِ ظریف کے نام سے یاد کیا ہے۔

یہ حس مفقود ہوتی تو زندگی اور زمانے کا آشوب انھیں معلوم نہیں کس اور کتنی درماندگی تک پہنچا دیتا۔ ان کی شاعری میں حرماں نصیبی کا احساس ملتا ہے لیکن کلام کی فضا مرض و مایوسی کی اتنی نہیں ہے جتنا تھمل اور تامل کی۔ غالب کا الہم کسی عشقیہ واردات یا المیہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اپنی حرمتوں کے شمار کامرا ہون ملتا ہے۔ یہ محض اتنا شخص کا نہیں ہے جتنا شاعر کا، جو ہر بڑے شاعر اور شاعری میں موجود ہوتا ہے۔ محض سے تطہیر ذات ہوتی ہے جو ترقع کی پہلی منزل ہے۔ غالب کا بچپن ان کی جوانی سے بہتر گزر اور جوانی بڑھا پے سے بہتر ان کے گرد روسائے دہلی کا طبقہ تھا، شاہد و شراب کی عیش کوشیاں تھیں۔ ذہن کے پس منظر میں اکبر شاہ جہاں اور ابراہیم شاہ کی بے در لغ بخشی، سخن نوازی، "خفی راظہوری ساختہ" کی داستانیں تھیں۔ دوسری طرف اپنے کمالات کا احساس اور عرض ہنر کا ارمان تھا۔ کہتے ہیں:

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعر نفر گوئے خوش گفتار

یہ تمام باتیں غالب کے کلام کو محزینہ لجھ دینے میں معاون ہوئیں۔ ان کی تمام زندگی "شیشه و سنگ" کی داستان بن کر رہ گئی تھی۔ حالی کی شہادتوں کے علاوہ غالب کے کلام میں اس بات کا ثبوت جا بجا ملتا ہے کہ غالب اپنے زبردست احساسِ ظرافت کے

طفیل زندگی کے جام سے تلپھٹ کے آخری قطرے بخوشی پیتے اور زندگی کی ناہمواریوں کو یہ کہہ کر ہموار کرتے رہے:

کیوں چھوڑتے ہو ذرد یہ جام میکشو
ذرہ ہے یہ بھی آخر اسی آفتاب کا (قائم)
اور کبھی یہ کہہ کر

واقع سخت ہے اور جان عزیز

ظرافت و مزاج کا اظہار ان کے کلام سے زیادہ ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ یہ ثبوت ہے غالب کے غیر معمولی احساس تناسب کا۔ وہ اس رمز سے واقف تھے کہ ظراحت کی جتنی سماں خطوط میں ہے غزل میں نہیں۔ ظراحت سے خطوط کی وقعت بڑھتی ہے، غزل کی گھٹتی ہے۔ اس زندہ دلی کے سہارے غالب کو زندگی پر اعتبار رہا۔ اپنی محبت پر اعتبار رہا۔ اپنے آپ پر اعتبار رہا اور جب اعتبار نہ رہا تب بھی یہ اعتبار رہا۔ جب ہی تو خوب رویوں کو چاہئے میں اپنی صورت کی پروانہ کی۔ نہ اسے خوب رویوں کے چاہئے میں مانع پایا۔

کسی شخص کو پر کھنے کا ایک قابل اعتماد ذریعہ یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس کے گرد کیسے لوگ جمع ہو گئے ہیں یعنی اس کے ہم پیشہ و ہم شرب و ہم راز کون ہیں۔ غالب کی شخصیت کا جائزہ اس نقطہ نظر سے بھی لینا ضروری ہے کہ وہ مردم دیدہ مصطفیٰ خال شیفۃ تھے۔ مقرب خاص آرزو دہ و صہبائی تھے اور سب سے بڑھ کر اردو ادب کے سب سے بڑے فرشتہ صفت انسان حالی کے مددوچ تھے۔ غالب اور حالی کے باہمی روابط پر نظر ڈالتا ہوں تو اس کا احساس ہوتا ہے کہ غالب کی شخصیت کا نقش حالی کے دل پر غالب کی وفات کے ۲۰-۲۵ برس بعد بھی جوں کا توں رہا۔ یہاں تک کہ وہ یاد گارِ غالب لکھنے سے بازنہ رہ سکے۔ اس پیغمبر شرافت کے دیلے سے غالب کی عظمت پر ایمان لانا کون شخص اپنے لیے باعثِ افتخار و سعادت نہ سمجھے گا۔ حالی اور غالب طبعاً ایک دوسرے کی ضد تھے لیکن حالی نے استاد کی تمام کمزوریوں اور فروگز اشتتوں کو محض اُس کی انسانیت اور فتنی صلاحیت کے پیش نظر بھلا دیا۔ اس سے اگر ایک طرف حالی کی نیکی اور بڑائی کا احساس ہوتا ہے تو دوسری

طرف غالب کی عظمت کو بھی بے حد با وقار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ او باشوں میں اگر غالب او باش رہے تو بڑوں میں بڑوں کی طرح ہے۔ کہیں بھی ”حقِ صحبتِ اہلِ کنشت“ کو نہ بھولے۔ انہوں نے ہمیشہ ابلِ فن کو اپنی طرف متوجہ رکھا۔ زمانہ منکرِ غالب کبھی نہیں رہا اور دہلی کے خواص نے غالب کی بڑائی کو ہمیشہ تسلیم کیا۔

حالی نے غالب کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ مرثیہِ حالی، غالب اور دہلی پر آخری لفظ ہے۔ شرافت و انسانیت اور صبر و سکوت کے حالی کو میں نے اس طرح بے اختیار و بے قرار ہوتے کبھی نہیں پایا۔ جب کبھی اس مرثیہ کو پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے غالب کی وفات نے حالی کی تمام خفیہ و خوابیدہ صفات کو جنمیں حالی کبھی نہیں ظاہر کرنا چاہتے تھے، دفعہ اس دھماکے سے ہر طرف بکھیر دیا ہو جیسے بڑی طاقتور بارود سے بھری ہوئی کوئی سرگنگ پھٹ جائے۔ اس مرثیے میں حالی نے اپنے کرب کا اظہار الفت و عقیدت و افتخار کے ان تمام رشتہوں کے ٹوٹنے سے کیا ہے جن سے حالی جیسا انسان ملک، معاشرہ، خاندان، اشخاص، اور اقدار سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھتا تھا۔ حالی کا مرثیہِ غالب اور اقبال کی نظم ”والدہ مر حومہ کی یاد میں“ ایسی نظموں کی یاد دلاتے اور نمونے پیش کرتے ہیں جہاں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مر حوم کی مفارقت کے کرب کے سوا محروم نے کوئی اور وسیلہ اظہار مثلاً زبان و بیان، صنائع و بدائع، صوت و صورت، نقل و حرکت اختیار کیا ہو۔ اظہار و ابلاغ کی کامیابی کی یہ معراج ہے۔ فن کا کمال ہی یہ ہے کہ فن کے سارے وسائل کام میں لائے گئے ہوں لیکن ان میں ایک بھی توجہ پر بارندہ ہو۔ مرثیہ نگاری کی انجلی میں یہی ہدایت ملے گی اوز مر ہیے کی برتری اور بقا اسی میں مضر ہے۔

ڈرتا ہوں کہ تخلی و در گذر کا جو ذخیرہ آپ نے آج شام میرے لیے محفوظ کر لیا تھلوہ کہیں ختم نہ ہو چکا ہو ورنہ اس مرثیے کے چند بند آپ کی خدمت میں ضرور پیش کرتا لیکن چاہتا ضرور ہوں کہ آسانی سے کہیں یہ مل جائے تو آپ اس کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ آپ کو حالی اور غالب دونوں سے ہمی کا ایسا قریبی، نازک اور حزین احساس ہو گا جو شاید پہلے نہ ہوا ہو!

خطبہ دوم

غالب کی شاعری

جناب صدر خواتین و حضرات!

فر جامِ سخنِ گوییِ غالب بتو گویم
خونِ جگر است از رگِ گفتار کشیدن!

انگریزی کے کسی ادیب یاد انشور غالب ای۔ ایم فارسٹر کا قول ہے کہ روزِ حشر حضور باری
عالیٰ میں یورپی تہذیب کی نمائندگی یا جواب دہی کے فریضے کو ادا کرنے کا مسئلہ اٹھا تو ہم بلا
تکلف شیکسپیر اور گوئئے کا نام پیش کریں گے۔ اس آزمائش سے ہم دوچار ہوں تو شاید اتنے
ہی وثوق سے غالب، اقبال اور ٹیگور کا نام لیں گے۔ ان کے کلام کے آئینہ خانے میں ہماری
تہذیب کی پوری جلوہ گری ملتی ہے۔ تہذیب کا اعتبار ان اقدار سے ہجعیں ہوتا ہے جن کی وہ
نمائندگی کرتی ہے اور اقدار کا سر چشمہ ذہن انسانی کا وہ شعور ہے جو ذات و کائنات کے عرفان
سے عبارت ہے۔ ذہن فرد کا ہوتا ہے اور وہی وسیلہ ہے کائنات اور انسان کے ادراک کا۔

چونکہ زمانی و مکانی اعتبار سے انسان کی حیثیت مخصوص و محدود ہے، اس لیے اس کے ادراک
و علم کی بھی حیثیت اضافی ہے، مطلق نہیں۔ مطلق علم اصلاً صرف اس ہستی کو حاصل ہو سکتا
ہے اور ہونا چاہیے جو زمان و مکان کے قیود سے باہر اور بلند ہو اور جسے ہر امکانی قوت و قدرت
پر دستر س ہو۔ اس کے باوجود انسانی ذہن کی نفسی کیفیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مطلق
کے تصور کی مدد سے کائنات اور اشیا کی غاییت کیفیت اور عمل کی تفہیم و تعبیر کی آرزو رکھتا
ہے۔ در حقیقت مطلق کے تصور کے بغیر، انسانی فکر کا نہ کوئی مقصد رہ جاتا ہے نہ محور۔ ایسی
صورت میں فکر انسانی کا وظیفہ صرف معلومات فراہم کرنے کا متراود ہو گا۔ وہ صرف یہ
معلوم کر سکے گی کہ یہ سب کیسے ہے۔ ایک حد تک شاید یہ بھی کہ یہ سب کیا ہے لیکن انسانی
ذہن یہ دریافت کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ یہ سب کیوں ہے۔ اس عظیم و حسین استفہام
کو غالب نے کس سادگی و پُر کاری سے پیش کیا ہے:

جبکہ تجھ بُن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
 یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزہ و عشوہ وادا کیا ہے؟
 ہلکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ نگہِ ہشم سرماسا کیا ہے؟
 سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

استفہام کے اس جمالی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کا جلالی پہلو وہ عظیم انحراف ہے، جس کے مرکب "خواجہ اہل فراق" قرار پائے ہیں جن کا ذکر خیر اقبال کے ہاں جا بجا ملتا ہے۔ ہر بڑے شاعر میں اس انحراف کا پایا جانا ضروری ہے۔ کیا عجب روزِ ازل انکارِ ابلیس کی صدائے بازگشت ہر بڑے شاعر کی روح میں جاگزیں ہو۔ مشیتِ الہی بھی شاید یہی رہی ہو۔

مد ہب، آرٹ، ادب اور فلسفہ اسی "کیوں" کی شمع کو اپنے اپنے فانوس میں گردش دیتے رہتے ہیں۔ "کیوں" کا مسئلہ آدم کی گندم چشی کی پاداش ہے یا انعام، یہ بتانا مشکل ہے لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جستجو ادب میں مسائل اور معنی آفرینی سے عبارت ہے جو وجود انسانی کے لامتناہی غیر منقطع اور کثیر الانواع مشاہدات، تجربات اور احساسات اور آرزوؤں کا احاطہ کرنے اور اس کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ جستجو خارجی حقائق یعنی اشیاء کائنات بشمول زمان و مکان سے بھی تعلق رکھتی ہے اور داخلی احوال سے جو غیر مرتبی محدود اور جملت انسانی سے متعلق ہوتے ہیں، ان کے احتساب اظہار و ابلاغ سے بھی۔ اقبال نے اس تمام انسانی تگ و تاز کو اپنی مشہور لظم جبریل و ابلیس کے اس مشہور مصروع میں بیان کر دیا ہے۔

"سوز و ساز و در و داغ و جستجو و آرزو"

غالب اپنی شاندار خاندانی روایات کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا مقصد اپنے کسی احساسِ مکتری کو چھپانا نہیں ہوتا اس لیے کہ مکتری کا وہاں دُور دُور دخل نہیں ہے۔ دوسری طرف اپنے احساس برتری کی تسلیکیں بھی نہیں چاہتے کہ وہ واقعی برتر تھے۔ برہمی یا بدولی کے نام میں کبھی کبھی کچھ کہہ دیا کر دالا تو یہ قابلِ اعتنا نہیں۔ غالباً صرف اس امر واقع کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ ایک شاندار روایت کے امین اور نقیب ہیں۔ اس طور پر وہ اپنی

شخصیت و شاعری کے اس پس منظر کو پیش کرتے ہیں جس کا احاطہ کیے بغیر نہ ہم ان سے اروشناس ہو سکتے ہیں نہ ان کی شاعری سے بہرہ مند۔ اس معاملہ میں غالب نہ یجا تکلف سے کام لیتے ہیں نہ خواہ مخواہ اپنے کو ہمہ وقت اور ہر جگہ حاضر و ناظر رکھنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ اپنے کو روشناس خلق رکھنا چاہتے ہیں۔ غالب کے زمانے میں آباؤ اجداد پر فخر کرنے میں عیوب نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے کہ ان کے زمانے میں آباؤ اجداد اس کی کوشش کرتے تھے کہ ان کے کارناموں پر ان کی اولاد فخر کر سکے۔ اب اگر ان کو عیوب سمجھا جاتا ہے تو ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ احساسِ تفاخر جس ریاضت و عبادت اور احساسِ ذمہ داری کا تقاضا کرتا ہے، وہ ہمارے بس کی بات نہ ہو۔ اسلاف و اخلف یا باپ اور بیٹے کے اتفاقی یا طبیعی نہیں بلکہ ارتفاقی رشتے کی وضاحت غالب نے ایک جگہ یوں کی ہے:

فرزند زیرِ تنغ پدر می نہد گلو^۱
گر خود پدر در آتشِ نمرود می رود

کسی اور شاعر کا یہ بیان بھی ذہن میں رکھیے:

آوازهٗ خلیل زبیاد کعبہ نیست
مشہور گشت زانکه در آتشِ نکونشت

اس امر کو آج کل کے باپ بیٹے (قدیم و جدید) سمجھ لیں تو زندگی کے کتنے فضحتے
دُور اور کشاکش کم ہو جائے۔

غالب نہ صرف ایک عظیم تہذیب اور روایت کے امین ہیں بلکہ عظیم تر تہذیب و روایت کے خالق بھی ہیں۔ ان کی روایت، ان کی شاعری ہے اور ان کی تہذیب، ان کی افسانیت۔ دونوں اازوال حسن اور قدر و قیمت کے حامل۔ غالب اور ان کے عہد کو نظر میں رکھیں تو ہم آج ان سے سوڈیڑھ سوال کے فاصلے پر ہیں لیکن ان کی شخصیت اور شاعری کی کرامت کو دیکھیے کہ پہلے سے زیادہ آج ہم ان کو حاضر الوقت پاتے ہیں۔ اردو کا کون ایسا قابل لحاظ شاعر اور ادیب ہے جو آج بھی یہ دعوا کر سکتا ہے کہ اس کا ذہن غالب کے

تصرف سے آزاد ہے اور یہ باوجود اس کے کہ غالب کا ادبی سرمایہ اور وہ کے مقابلہ میں بہت مختصر ہے۔ انہوں نے ڈرامے ڈال یا افسانے نہیں تصنیف کیے۔ مرثیہ نگاری نہیں کی۔ باضابطہ طور پر نہ فن تقدیم کو اپنایا۔ مرجع نگاری کی، نہ انشائیے لکھے اور نہ کوئی قاموس اصطلاحات مرتب کی، نہ فنون لطیفہ پر کوئی مقالہ لکھا لیکن سر ساز اور نغمے میں اسی خانہ خراب کی آواز ملے گی۔ اسی کاخونِ جگر کہیں رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے، کہیں آنکھوں سے پیکتا ہے۔ غالب ہماری تہذیب اور ہمارے شعر و ادب کا ایسا جو ہری عضر بن گئے ہیں جو مسلسل و مدام تابکار رہتا ہے۔ اس کے سلاسل عمل و ردِ عمل سے اردو ادب اور اس کے ادیب مرتعش ہوتے ہیں۔ کہیں ”بجلوہ ریزی باد“، کہی ”بِ پر فشانی شمع“۔

غالب نے ایک جگہ اپنی ایک آرزو کا اظہار یوں کیا ہے:

مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو
تالہ بلبل کا درد اور خندہ گل کا نمک

ان کا ارمان کہ ان کو تالہ بلبل کا درد ملے، یقیناً پورا ہوا لیکن ان کی دوسری آرزو بھی یعنی خندہ گل کا نمک، محظوظ کے حق میں پوری ہوئی ہو یا نہیں، انھی کے حصے میں آئی۔ زندگی کا افسانہ و افسوس اسی تالہ بلبل اور خندہ گل سے عبارت ہے۔ اسی درد و نمک کی حیرت انگیز اور بے مثل آمیزش سے غالب کی شخصیت کا خیر اٹھا ہے اور ان کی شاعری میں آب و در گنگ آیا ہے۔ اعلانِ ذاتی شعری کی ترتیب، تشكیل اور تہذیب کا محرك اعظم یہی توافق و توازن ہے۔ غالب کی ہر بات میں ایک بات، اسی کی دین ہے۔ حیاتِ انسانی کی عجیب خصوصیت ہے کہ وہ بیک وقت ارضیت و ماوراءِ ایت دونوں میں پیوست ہے جس کی بناء پر تقدیرِ انسانی ایک ایسی صورت و معنی ہے جو کبھی سادہ نظر آتی ہے کبھی پر چیز، کبھی یک رنگی اختیار کرتی ہے کبھی متنوع نظر آتی ہے۔ کبھی افلک میں گم معلوم ہوتی ہے کبھی زمین میں پیوست ملتی ہے، کبھی وہم و خیال ہے، کبھی حقیقتِ ردِ برو۔ بالفاظ دیگر ہماری شخصیت عالمِ حقیقی اور عالمِ خیال میں مستقلًا عملِ رد و قبول سے عبارت ہے۔ اس رد و قبول میں ہر شخص آزاد ہے۔ ترک و انتخاب اس کا ہوتا ہے خواہ وہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر۔

شخص اور اس کے کارنے سے کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ اس کا یہ رد و قبول اس کو بالآخر کس طرف اور کہاں لے جاتا ہے یعنی مجموعی طور پر وہ ہم کو صداقت عدل، خیر، حسن، علم، شرافت، شایستگی یعنی انسانیت سے قریب و ہمکنار کرتا ہے یا اس سے دور لے جاتا ہے۔ موجودہ تقریب غالب کی زندگی اور شاعری کو اسی میزان پر تو لئے کی ایک ناتمامی کو شش ہے اور بس!

جدید عہد کا ایک بڑا مسئلہ جو علوم و فنون کی بے پناہ ترقی اور اضافے سے پیدا ہوا ہے یہ ہے کہ ہم اقدار حیات مثلاً صداقت کے تعین یا اس کا احاطہ کرنے کے لیے کیا ذرائع یا اصول کام میں لا میں جو ہم کو کسی متفقہ نتیجے پر پہنچنے میں مددیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، علم و آگہی کے حاصل کرنے کے طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی طریقے اور ذرائع مختلف ہوتے ہیں جن کی بنا پر مختلف نتائج سامنے آتے ہیں جن کی مزید وضاحت اور تنقید کے بے شمار امکانات ہیں۔ جدید تمدن خاص طور پر مستقبل میں اس کے درتقا کے امکانات کو مد نظر رکھیں تو ایک ایسے تمدن کی نشان دہی ہوتی ہے جو گلیخاڑ اسیدہ سائنس ہو گا۔ اس طور پر آیندہ زمانے میں انسانی تہذیب کے ماضی کے سامنے سرمایہ کی افہام و تفہیم، تفسیر و تعبیر اور اس کی قدر و قیمت کا تعین ان اصولوں اور ذرائع کی مدد سے کیا جائے گا جو سائنس کی دین ہوں گے۔ یہ کہنا کہ یہ اچھا ہو گایا رہا، کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ یہ صورت اس کے مقاضی ہے کہ ہم طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی ذرائع علم و آگہی کی نوعیت کے بارے میں مسلسل معلومات بہم پہنچائیں تاکہ ہم انسانی ترقی کی ناقابل تقسیم، عالم کیر اور تخلیقی تحریک کی نئی راہوں کو دریافت کرنے اور ان پر گامزن ہونے کی اہلیت اور حوصلہ پیدا کر سکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے عہد کے متعدد و مستند ہنوں نے ان مسائل پر سوچنا شروع کر دیا ہے۔

اس سلسلے میں غور طلب بات یہ ہے کہ علوم انسانی کی مختلف شاخوں کی نشوونما کس طرح ہوتی ہے۔ اس سوال سے قطع نظر، یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ گزشتہ تین سو برس میں بمقابلہ دوسرے علوم کے سائنسی علوم کی نشوونما زیادہ اور نسبتاً واضح اور مخصوص خطوط پر ہوئی ہے۔ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے، سائنس داخلی اور خارجی علوم

میں امتیاز اور تفریق کرتی ہے۔ پھر بھی یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ہر علم کی بنیاد اصلاً ابلاغ ہے۔ اس ابلاغ کے ذرائع سائنس کے کچھ اور ہیں، ادب، آرٹ، اور فلسفے کے کچھ اور لیکن ان کا اصل مقصد جیسا کہ ایک دانشور نے بتایا ہے ایسے مل بنانے ہیں جو اس "صدقت" سک چینچنے میں مددیں جس کو ایک ایسی حقیقت قرار دیا جاسکے جو قابل اظہار اور ابلاغ ہے۔ اگر سائنس کے ذرائع منطقی استدلال، پیالش اور اعداد ہیں جو معروضی حقائق کے تعین اور تفہیم میں مددیتی ہیں تو شعر و ادب کے ذرائع وہ تجربات و احساسات ہیں جن کی تصدیق ذہن و شعور انسانی سے ہوتی ہے۔ اس ضمن میں غالب کی شخصیت اور شاعری کے مطالعے سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے ہماری داخلی حیاتی زندگی کا جو احساسات و ارادات، کیفیات، اور جذبات، بالفاظ دیگر جملہ ذہنی تجربات سے عبارت ہے، نہایت جامع حقیقت آمیز، گہرا، دلپذیر، متنوع اور معنی آفریں اظہار و ابلاغ کیا ہے۔ اس سے ہمارے ادب میں دائمی قدر و قیمت کے ادبی اقدار کی تخلیق میں بیش بہاء دملی ہے۔ غالب سے ہماری روزافزوں دلچسپی اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ آج بھی ہمارے ذہنی سفر میں ایک ایسے مفید رفیق و رہبر کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی موجودگی سے اس سفر کی اہمیت اور دلچسپی میں بڑے خونگوار اضافے کا احساس ہوتا ہے۔

آرٹ، ادب، اور اس قسم کی دوسری سرگرمیاں اصلاً انسان کے جمالیاتی احساس و شعور کی ترجمانی، نمایندگی اور اظہار سے تعلق رکھتی ہیں۔ مذهب کا اعلاترین تصور اسی احساس و شعور سے متعلق ہے جو عقل اور وجد ان کی آمیزش سے ایک ایسے تجربے کی حیثیت اختیار کرتا ہے جس کی براہ راست تصدیق کبھی اس جذبے طمانتی سے ہوتی ہے جو مجموعی طور پر انسانی شخصیت کی آسودگی کا باعث ہوتا ہے یا جو کبھی ایسی امنگ یا ترپ ہوتی ہے جس کی گرمی و گداز سے محض خیال اور حسن عمل کا ظہور ہوتا ہے۔

جمالیاتی احساس کا تجزیہ کچھ تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ مختلف عناصر کا ایک نہایت چیزیدہ مرکب ہے جس کے نمو اور افزایش میں فکر، مشاہدہ، آرزو، علم اور تجربہ سمجھی شامل ہوتے ہیں اس لیے ادبی تخلیقات بالخصوص شاعری کی قدر و قیمت معین کرنا

آسان نہیں ہے۔ برخلاف اس کے سائنسی تحقیق یا عمل کے ذرائع یا معیار متعین کرنے میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ ان کو معمروضی علمی تجربے یا ریاضیاتی پیمائش کی مدد سے صحیح یا غلط قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ سائنس ان حفائق اور ان کے امکانات سے بحث کرتی ہے جن کا وجود ایک ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ سائنس ایک ایسی کائنات یا اشیائے کائنات کے زمان و مکان، جامالت و ضخامت، عناصر و عوامل اور کسر و انکساری کی تحقیق اور جستجو سے تعلق رکھتی ہے جس کا اسے علم ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس دال اس دنیا کی دریافت اور اس کے مسائل سے دلچسپی رکھتا ہے جس کی تخلیق ہو چکی ہے اور اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے لیکن شاعر، ادیب، موسیقار مصور اسی کائنات کی مخلوق ہوتے ہوئے نئے جہان اور نئی کائنات کی تخلیق پر قدرت رکھتے ہیں جن کے یہ دان و اہر من، ارض و سما، لمس و لذت، کشش و گریز اور حضور و سرور کا خالق خود شاعر ہوتا ہے۔ شاعر کے اس جہان میں ہم ان حقیقوں، آرزوؤں اور بصیرتوں سے آشنا ہوتے ہیں جو انسان کے شایستہ ذہن، ذوق، اور ظرف کی مستقل اور مسلسل آبیاری اور سیرابی کا باعث ہوتی ہیں۔ ہمارے ادب میں غالب اور ان کی شاعری نے ایک ایسے جہانِ معنی کی تخلیق کی ہے جس میں ہماری تہذیبی زندگی کے لالہ کا رو تازہ کار رہنے کے امکانات روشن تر ہو گئے ہیں۔

آپ مجھ سے متفق نہ ہوں تو اور بھی اس امر پر غور فرمائیں کہ ہمارے آج کے شاعر اور ادیب اپنی تہذیب کے بالخصوص اور تہذیب انسانی کے بالعوم ان عناصر کی تلاش میں اتنی کاوش کیوں نہیں کرتے جن کے انکشاف اور بازیافت سے شاعر اور شاعری دونوں گرانمایہ اور تازہ کار رہتے ہیں۔ کیا انسانی زندگی میں عصری رجحانات یا یہ جانات اتنے اہم ہیں کہ ہم گلیٹا انھی کی عکاسی میں سرگردان یا اسیری میں بے دست و پار ہیں۔ اگر نری تقلید ایک جامد اور مجھوں ذہن کی غمازی کرتی ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ نری جدیدیت (اس لفظ کو عام معنوں میں استعمال کر رہا ہوں، کوئی اصطلاح پیش نظر نہیں ہے) فکر کے انتشار، اختلال کا اظہار کرتی ہو۔ اگر اول الذکر گلدستہ طاق نیاں ہو جاتے ہیں اور موخر الذکر آپ اپنی

اگ کے خس و خاشاک، تو وہ نیا آدم کہاں سے آئے گا جو قصہ جدید و قدیم کو دلیل کم نظری تائے گا اور حمنِ حیات کی آبیاری کے لیے ساقی سے آب بقاۓ دوام کا طلب گار ہو گا جس کے لے خود لبِ ساقی پر مکر رصلائے ہے۔ کوئی اور ہوتا یا کہیں اور کی بات ہوتی تو کہتا غالب کو ڈھونڈو یا اقبال کو لاو۔ آپ سے کیا کہوں جس کے ہاں دونوں ہیں۔

عام تاریخ کی طرح ہر زبان کی تاریخ شعر بھی دو ائم میں اپنا تکملہ کرتی ہے۔ شعر سادگی سے ابھرتا ہے۔ ابتدائی دور کے فن کار دل سے نکلے اور دل میں اترے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان کا سہارا زبان کا جذبائی لجھے ہوتا ہے، اس کا روز مرہ ہوتا ہے۔ وہ بات اس انداز سے کہتے ہیں کہ ”میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے“ بہت جلد ترصیع کاروں کا ہجوم نکل پڑتا ہے جن کی ہر بات میں ایک بات ہوتی ہے۔ وہ شعر کی تزمین و آرائش کرتے ہیں۔ آرائش کے زیور اور لباس سے سادہ و معصوم محسن گرانبار ہو جاتا ہے اور آرائش وزیبا لش و سیلہ نہیں مقصود بن جاتی ہے۔

اردو تاریخ شعر میں دکنی شاعری کا دور اس کا ابتدائی دور کہا جاسکتا ہے۔ ابنِ نشاطی سے دوسری روایت شروع ہو جاتی ہے۔ دہلی والوں نے شعر کا سراپھرو ہیں سے اٹھایا جہاں محمد قلبی قطب شاہ و جہی اور غواصی نے چھوڑا تھا۔ لکھنؤ جا کر اردو شاعری پر ترصیع و تکلف کا غلبہ ہوتا ہے جس کے سیل کو شاہ نصیر اور ذوق کی محاورہ بندی بھی نہ تھام سکی۔ تاریخ شعر کے ایسے مقام پر اکبر آباد کا ایک نوجوان دہلی کی بساطِ شعر پر تازہ وارد کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے۔ اکبر آباد میں اس کی تربیت نظیر اکبر آبادی کے مکتب میں نہیں بلکہ بیدل، ناصر علی، نظیری، عرفی اور ظہوری کے دبستان میں ہوئی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز تک اردو زبان بھی اپنے ارتقا کے ایسے مرحلے پر پہنچ گئی تھی جہاں اس کے ہندی اور فارسی اجزاء ترکیبی میں جمود سا آگیا تھا۔ یہ وسعت طلب تھی لیکن شعراء دہلی اسے محاورہ بندی میں قید کر رہے تھے۔ لکھنؤ کا دبستان اس کے محسن ظاہری سے کھیل رہا تھا۔ فکر وہیت کی توسعی کی جانب کسی کی توجہ نہیں تھی۔ غالب جن کے شاعرانہ ذہن کی سب سے بڑی خصوصیت نفرز گولی اور جدت طرازی تھی، نہ زبان سے مطمئن تھے نہ اسلوب

شعر سے۔ ان کا ماحول نظیر اکبر آبادی کے عوای ماحول سے بالکل مختلف تھا اس لیے کہ لڑکپن میں وہ اکبر آباد کے بازاروں اور گلی کوچوں میں نہیں، محل سراؤں اور ایوانوں میں کھینے والوں میں تھے۔ اردو کے عوای ادب سے ان کو مطلق سرداڑانہ تھا۔ ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں اپنے ہی نسب کا خیال جاگزیں نہیں تھا، اردو کو بھی وہ ایک نسب دینا چاہتے تھے اپنا ہی نسب۔ یعنی ایران و عجم کا نسب۔ ایسا انہوں نے کرد کھایا۔ زبان اور شعر و ادب کی تقدیر کو اس طرح بدلت اور چمکا دینے کا امتیاز بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا ہو گا۔

شیفہ کی طرح شاید غالب کا بھی نظیر اکبر آبادی کے بارے میں یہی خیال رہا ہو گا کہ ”شاعر سوقی است“ یوں بھی غالب کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں جرج نہیں کہ وہ جس کسی کو غیر سوقی سمجھتے ہوں گے اس پر ان کا غیر معمولی کرم ہوتا ہو گا۔ چنانچہ اپنے ترکی نسب پر فخر کرنے والا یہ پشمیاندہ اشراف یا خلاصہ اسلاف اس پر کب رضامند ہو سکتا تھا کہ کسی اندازِ سوقی کو اپنائے یادی والوں کی مانند ”محاورے کے ہاتھ منہہ توڑے“ اس کی ہنچ اور شاعرانہ انفرادیت بالآخر متاخرین شعراء فارسی کی طرف مائل ہوئی۔ ان شعرا اور بیدآل کے سامنے غالب کی کیفیت ایک ”طفلِ بد معاملہ“ کی تھی جس کے سر سے اس کا عصا بلند ہو۔ غالب کی ابتدائی شاعری کی کوئی فن کارانہ قدر و قیمت ہو یانہ ہو، ان کے جدات طراز ذہن کو رنگ بیدآل میں تسلیم ضرور ملتی تھی۔ اس لیے کہ وہ نہ تو ”سب ٹھائیں پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجara“ کے شاعر تھے نہ ”پل بننا چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا“ کے شاعر۔ جو اسلوب دوسرے شاعروں کے لیے باعثِ شهرت تھا اسے وہ اپنے لیے باعثِ لعنت سمجھتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ”اسد اور شیر اور خدا اور جفا اور وفا میری طرزِ گفتار نہیں“۔ کوچھ بیدآل میں غالب کی تربیت ضروری تھی یا نہیں اس سے ان کے دوسرے دور کی شاعری میں پُر کاری آئی یا نہیں، اس کا بتانا بعض اعتبار سے مشکل ہے۔ غالب طرز بیدآل کے قائل تھے۔ نبھ حمید یہ میں غالب کے جتنے اشعار درج ہیں، ان میں سے بیشتر میں بیدآل کارنگ واضح طور پر ملتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس امر کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ غالب بیدآل کے کتنے ہی قائل کیوں نہ رہے ہوں انہوں نے ایک جلد

”طرز بیدل بجز تفہن نیست“ بھی کہا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں غالب کے کلام میں سادگی و پُر کاری بیدل کی دین نہیں ہے اس لیے کہ بیدل کا کلام چاہے جو کچھ اور ہو، سادہ و پُر کار نہیں ہے۔ دقيق اور اکثر بے ضرورت دقيق ہے اور سادگی و پُر کاری کا نقیض ہے۔ غالب کی شہرت کا سبب ان کا اردو کا متداول مختصر و منتخب مجموعہ ہے، نخ حمید یہ نہیں۔ سادگی اور پُر کاری غالب کی بالکل اپنی ہے۔ کسی کے اسلوب کی تقلید سے آج تک کوئی شاعر یا فن کار مجتہد یا معظم نہیں مانا گیا۔

غالب کن فارسی شعر سے متاثر ہوئے اس پر ان کے ابتدائے عہد شاعری سے بحث چلی آرہی ہے۔ حالی نے جو غالب کے معیبر شاگرد و سوانح نگار اور بذاتِ خود شعرو ادب کے اچھے مہصر مانے جاتے ہیں، غالب کا موازنہ بعض ان نامور فارسی شعر سے کیا ہے جنھوں نے ہندستان آ کر اور ہندستان میں رہ کر اپنے کلام سے ہم کو مستفید و متاثر اور ہندی فارسی شعرو ادب کو مالا مال کیا۔ ان سے بہرہ مند ہونے کا خود غالب نے بڑی فراغدلی سے جا بجا اعتراف کیا ہے۔ بعض حلقوں میں اس پر زور دیا جا رہا ہے کہ غالب پر بیدل کی گرفت بنیادی اور غیر منقطع ہے۔ اس کی تائید میں جو شواہد پیش کیے جاتے ہیں ان سے انکار نہیں لیکن غالب کے اردو فارسی کلام ان کے خطوط اور ان کے بعض بیانات کو نظر میں رکھیں تو معلوم ہو گا کہ غالب نے اپنے نامور پیشوروں سے کتنا ہی کیوں نہ استفادہ کیا ہو، وہ بنیادی اور غیر منقطع طور پر غالب ہی ہیں۔ غزل پر غزل کہنے، یکساں تراکیب و تلازمه، رموز و علام، استعمال کرنے یا کبھی کبھی سوچنے کا یکساں انداز اختیار کرنے سے، کوئی شاعر دوسرے شاعر کا لازماً مقلد نہیں بن جاتا۔ شعر اکبھی کبھی اس طرح بھی طبع آزمائی یاد و سروں کے میدان میں زور آزمائی کر لیا کرتے ہیں۔ کسی بڑے شاعر یا فنکار کے بارے میں اب تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہ اپنے بجائے کسی اور کے سہارے پر کھڑا ہے۔ غالب سے قطع نظر حالی اکبر اور اقبال کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی کے مقلد یا خوشہ چیز ہیں۔ وجہ کوئی ہو، بیدل کی پیروی آج تک کسی معروف فارسی شاعر نے کی نہ اردو شاعر نے۔ آخر کیوں؟

بیدل کی غزلوں سے کہیں زیادہ دوسرے اکابر شعرا کی غزلوں پر غالب نے طبع آزمائی کی ہے لیکن کسی کے مقلد نہیں قرار پائے۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر فنکار اوس طیا معمولی درجے کا ہے تو وہ اپنے پیشروں تک یا اس سے بھی پچھے رہ جاتا ہے اور اپنے قد و قامت میں کوئی اضافہ نہیں کر پاتا لیکن اگر اس کی تخیل میں تازگی جذبے میں حرارت اور فکر میں گرانما نگی ہے اور وہ جودت و ندرت ہے جسے انفرادیت کہتے ہیں تو وہ اپنے پیشروں کے چھوڑے ہوئے وسائل سے ضرور کام لیتا ہے لیکن اس کی سمت ور فتار اور منزل مقصود سب جدا گانہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے مسلک کا مجتہد یا شریعت کا امام قرار پاتا ہے۔ غالب ایسے ہی فنکار ہیں۔ غالب نے اپنے پیشروں اکابر شعرا کے کلام کو ذہن میں رکھ کر اپنے کلام کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ کمتر کسی سے نہیں ہے، یا تو برابر ورنہ بہتر ہے۔ غالب کا فارسی کلام بیدل کے رنگ سے خالی ہے۔ میرا خیال ہے کہ فارسی یا اردو شعرا میں سے کسی قابل لحاظ شاعر نے بیدل کی پیروی نہیں کی۔ بیدل کی شاعری ہمارے آپ کے لیے کتنی بھی حرکی ہو، وہ کسی شاعر میں حرکت نہ پیدا کر سکی۔ حالانکہ معمولی درجے کے شعر اہر حرکت پر قادر ہوتے ہیں۔ غالب کی جیینیس بیدل کی جیینیس سے بالکل علاحدہ ہے۔ غالب جتنے حیات کے شاعر ہیں اتنے مجرّدات کے نہیں۔ شخص اور شخصیت کے اعتبار سے بھی غالب، بیدل سے جدا ہیں۔ بیدل بہ روایت خود خوارق عادات پر قدرت رکھتے ہیں۔ غالب بتاں خود آر ابادہ ناب و گوارا، صاحبان انگریز اور روسائے عظام کے قائل تھے۔ بڑے شاعر امت کبھی نہیں ہوتے پیغمبر ہمیشہ رہتے ہیں۔

садگی کے ساتھ یہ پُر کاری غالب کے آخری دورِ شاعری تک قائم رہی۔ اسی نے مرزا غالب کو ”اندازِ بیان اور“ کا مرتبہ بخشنا ہے۔ غالب سے پہلے اردو شاعری یا تو اندازِ بیان کی شاعری تھی یا زبان کی۔ اردو شعرا ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے تجربات حیات محصور اور جن کا علم محدود ہوتا تھا۔ روایت پسندی ان کے مزاج میں داخل تھی اس لیے کہ روایت کے ذریعے وہ بازار اور بار دونوں میں جلد مقبولیت حاصل کر لیتے تھے۔ شاعری ان لوگوں کے لیے ذوق و ذہن کے تقاضے، ان کا کسر و انکسار یا خود کو

پالینے کی کاوش نہیں بلکہ ایک طرح کی میرکائیکی سہل انگاری بن گئی تھی۔ شاعری سے زیادہ استاد کا اقتدار یا پہلوانِ سخن کا دور دوڑھا تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں غالب نے خانہ داماد کی حیثیت سے دہلی میں قدم رکھا اور دہلی والوں کو عصائے بیدل سے ہانکنے کی کوشش کی تو دہلی والوں کا عام رہ عمل وہی تھا جو ان کے ایک عام مستعمل لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے یعنی اکبر آباد کا بانگزوٹے اغالب نے اہل دہلی کو سخنوار ان جاہل سمجھا اور وہ مرزا نوشہ کو خدا کے پروردگرتے رہے۔ "مگر ان کا کہایا آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" بعد میں مرزا نے انھی سخنوار ان جاہل کو سخنوار ان کا مل کھا۔ بہر حال نووارد کے ذہن پر دلی والوں کا جو نقش بیخا تھا وہ ان کے اس دور کی شاعری میں اس طرح نمایاں ہے:

دل کے رہنے والو اسد کو ستاؤ مت

بیچارہ چند یوم کا یاں تیہمان ہے

غالب کی زندگی میں دہلی والوں سے مقابلہ شکست و فتح دونوں کا منظر پیش کرتا ہے۔ ابتداء شکست سے ہوئی اور "مکفتہ غالب" کو سننے اور پڑھنے والے نایاب رہے۔ بقول ان کے:

ہمارے شعر یہ اب صرف دل گلگی کے اسد
گھلا کہ فائدہ عرض ہر میں خاک نہیں

دوسرے دور شاعری میں غالب کی فارسی کی جانب رغبت و انبہاک کی بڑی وجہ یہی تھی کہ اہل دہلی نے ان کے کامِ ریختہ کی قدر دانی نہیں کی۔ فارسی کا ذوق خواص دہلی تک محدود تھا۔ دہلی کا یہ "ادبی اشرافیہ" غالب کا ہمیشہ معتقد رہا لیکن غالب کی مشکل یہ تھی کہ اپنے فارسی شعر کے ذریعہ وہ قلعہ معلمانی تک نہیں پہنچ سکتے تھے جہاں ریختہ ذوقِ ادب کا جزو بن چکا تھا جہاں سخن فہم شاہ ظفر تھے اور سخن گواستاد ذوق۔ ایسی فضائیں غالب کو نہ

^۱ اس زمانے میں اہل دہلی باہر والوں کا اپنا جیسا شاید نہیں سمجھتے تھے۔ وہ بھی کمزی بولی کے لب و لبجھ اور کرخنداروں کے لفٹ میں اس طرح کے میزائلز کی کمی نہیں ہے۔ اشراف، عموم یا پچھو من دیگرے نیست کا جذبہ۔ بھاہ ہو یا بر اسہبی مسلمانات میں رہا ہے۔

کوئی طرفدار مل سکانہ شہر کی مصاہب حاصل ہو سکی۔

غالب کی انسانیت کے لیے یہ گھلا چیلنج تھا۔ ایسی انسانیت کے خلاف جس کی پرورش نسلی تفاخر اور علمی پندار کے ماحول اور روایات میں ہوئی تھی۔ غالب سے قبل نامور اردو شعر ادرا بر سے بھی اٹھتے رہے اور بازار سے بھی۔ سپاہی پیشہ بھی ہوئے ہیں اور سجادہ نشیں بھی، لیکن غالب کا تعلق عمائدین کے ایک ایسے طبقہ سے تھا جس کے ہاتھوں سے مال و منزلت دونوں جا چکی تھیں اور حرست و پندار رہ گئے ہوں۔ غالب کے حزن و رشک دونوں کا مأخذ و منع یہی طبقاتی احساس زیاد تھا۔ ان کی زندگی کاالمیہ یہی تھا۔ ان کی حرست میں ان کی حاجتوں سے زیادہ رہیں جس کی جھلک ان کے کلام میں جا بجا ملتی ہے مثلاً

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یاس جسارت اور کتنے مثل طنز یہ حزنیہ انداز سے شاعرانہ حدود میں رہتے ہوئے کہا ہے:

نا کردہ گناہوں کی بھی حرست کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غالب کا حزن عشقیہ واردات کا نہیں بلکہ سماجی واقعات و حالات کی پیداوار تھا۔ ان کے کلام میں حزن کی ایک زیریں نے ملتی ہے اور ایک طرح کی شدید نا آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ایسے شخص کی حرمت نصیبی ملتی ہے جس کا بچپن اور ابتداء بب، شمع و شامب و شعر و شراب میں گزر اہوا اور نامساعد حالات کے نتیجے میں خود کو

”اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے“ کا مصدقہ پاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بڑے فنکار تہذیبی زوال کے سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔ غالب کے حزن کو اگر سیاسی اور معاشرتی حالات کے پیش منظر میں دیکھا جائے تب بھی اس صداقت کا احساس ہوتا ہے کہ غالب ایک زبردست شکست و ریخت کے عہد کی پیداوار ہیں۔ جس دل میں ان کا ورود ہوا تھا، وہ ”دل لینے والی“ دل نے تھی بلکہ ایک اجزتا ہوا دیار تھا۔ ان کے چاروں طرف شکستگی کا عالم تھا اور اس عالم میں خود ان کی شخصیت کی شکستگی نے الیہ کے احساس کو مکمل کر دیا تھا۔

ایک ایسی انفرادیت جو ”آگئی اور غفلت“ دونوں کو اپنی ”نسبت“ سے دیکھتی ہو

اور جس کا حال یہ ہو:

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

وہ ماتھم یک شہر آرزو کی صلیب کاندھوں پر اٹھاے نہ پھرے تو اور کیا کرے۔ غالب کے حزن کے بیشتر مأخذ مادی ہیں۔ ان کا غم زیادہ تر ”کھائیں گے کیا“ کا غم ہے۔ ہر چند کہ وہ غمِ عشق کا بھی تذکرہ جا بجا کر دیتے ہیں۔ یہ عیشِ غم بھی ہے۔ فائقی نے بھی ایک قطعے میں جو اپنے سنگ مزار کے لیے لکھا تھا ”خدا نداشت“ کی طنزیہ شکایت کی ہے۔ غالب نے ”ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدار کھتے تھے“ محض اس لیے کہا ہے کہ ”زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب“۔ دوستوں عزیزوں، شاگردوں، اور شاہ و خداب سے غالب کے تقاضے بے شمار تھے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ”کس کی حاجت روا کرے کوئی“۔ اقبال کا خیال ہے ”کرتی ہے حاجت شیر وں کور و بہا“ لیکن اسد اللہ خاں کو حاجت ہی نے شیر بنادیا تھا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

از مہر جہاں تاب امید نظرم نیت
ویں تشت پہ از آتشِ سوزاں برم رین

کچھ تو دے اے فلکِ نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

بُر تہید ستم دبے برگ خدا یا تاچند
بِ خُن شاد شوم کا یں گہراز کاں منت

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اودھار

ان اشاعر میں اس طرح کے اشعار کو غالب کی حاجت مندی کا معتبر ترجمان بھی نہیں کہہ سکتے۔ آلامِ روزگار کے اظہار میں آسودہ حال شعر اکا بھی یہ لب و لہجہ رہا ہے جو اتنا واقعاتی نہیں ہے جتنا روایتی لیکن غالب کے سوانح حیات کے بعض مخصوص سیاق و سبق میں ان اشعار کو نظر اندازنا کرنے پر کوئی الزام راوی پر بھی نہیں آتا۔

جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، غالب نہ توالم کے شاعر ہیں نہ ان کی شاعری المیہ ہے۔ تاہم ایک زوال آمادہ تہذیب و تمدن کی پیداوار ہونے کے اعتبار سے ان کے یہاں ایک مہذب المم کی کیفیت ملتی ہے جس کے لیے خون کا لفظ استعمال کرتا رہا ہو۔ ان کی شاعری کا عام لہجہ حزنیہ ہے۔ حرث، داغ تمنا، بلا، برق وغیرہ کے الفاظ جوان کی شاعری میں بار بار آئے ہیں، وہ اس کی غمازی کرتے ہیں۔ اپنے خطوط میں دولت و سلطنت و شہرت سے عام بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ ایک ”علم بیرنگی“ کہ جہاں ”نہ تماشا ہے نہ ذوق“ کی تمنا کی ہے، وہ بھی ایک قسم کے ذاتی خون کا اظہار ہے۔

غالب کے جذبہ رشک اور خون کا مأخذ ایک ہی ہے یعنی ان کی شدید انفرادیت اور ماذی نا آسودگی۔ وہ صبر و شکر کی صفات سے نا آشنا تھے اور اسے شخصیت کی کمزوری سمجھتے تھے۔ یہ نا آسودگی اپنی شدید شکل میں بیزاری اور بے دلی ہائے تماشا“ کی کیفیت پیدا کر لیتی تھی لیکن عشقیہ واردات کے بیان میں جب یہ رشک کے انداز میں نمودار ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ غالب سے زیادہ مہذب رشک کرنے والا اردو شاعری میں پیدا نہیں ہوا۔ غالب کے عشقیہ واردات میں کانوں کو آنکھوں اور آنکھوں کو کانوں پر رشک آتا ہے کہ محبوب کے قدموں کی آہٹ یا اس کے حسن کی جھلک پہلے کون پاتا ہے۔ رشک اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ جب انسان خود اپنے سے رشک کرنے لگتا ہے:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

غالب کے اس رشک کا تصرف ایک جگہ محبوب تک پہنچ چکا ہے مثلاً

نحوت نگر کہ می خلذ اندر دلش زرشک
حرف کے در پرستشِ معبد میرود
بیروں میا ز خانہ بینگام نیم روز
رشک آیدم کے سایہ بہ پابوس میرود

اس رشک کا مورد زیادہ تر خود غالب کی ذات ہے لیکن ان کے عشقیہ واردات میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے:

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعدِ قتل
میرے پتے سے غیر کو کیوں تیرا گھر ملے

غالباً میر جیسا مہذبِ عاشق اس سعادت کو کبھی ہاتھوں سے نہ جانے دیتا کہ محبوب اسے اپنی گلی میں دفن ہونے کا اعزاز بخش رہا ہے۔ غالب کی انا نیت اور جذبہ رشک کو ملحوظ رکھیے تو ان کی عشقیہ واردات کی نوعیت خود بخود سمجھ میں آجائے گی۔ غالب نے اردو غزل کی عشقیہ روایت کو جو پر دگیٰ پیچ میرزی اور کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل جانے سے عبارت تھی، ایک مردانہ آن بان عطا کی۔ وہ ایک بے نیاز عاشق ہیں۔ ان کا بس چلے تو محبوب سے اپنے ناز خود اٹھوائیں، دھول دھپے تک تو ان کے عشق کی نوبت ایک ہی بار پہنچی لیکن اپنے ناز اٹھوانے کی واردات ان کے یہاں جا بجا ملتی ہے۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حسن کو شایستہ غالب ہونا پڑتا ہے ورنہ معمولی درجے کے محبوبوں سے صاف کہہ دیتے ہیں:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

غالب کے اس رشک میں ان کی غیر معمولی نسلی حمیت کو بھی دخل ہو سکتا ہے جس کا وہ اپنے کو نمایندہ سمجھتے تھے۔ غیرت، حمیت اور رشک کا اونچے درجے کے جانوروں ہو را علا قبیلے کے افراد و اشخاص میں پایا جانا تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ جذبہ اس وقت سے بر سر کار ہے جب انسان پہلے پہل تہذیب و تمدن کی سرحدوں میں داخل ہوا ہو گا۔ جب سے اب تک یہ حس کافی کمزور ہو چکی ہے۔ شاید اس وقت معدوم ہو جائے جب وہ تہذیب

کی آخری حدود پر پہنچ جائے۔ ان برکتوں کے آثار کچھ تعجب نہیں غالب نے اپنے ہی عہد میں دیکھے ہوں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے غالب کا عشق وارداتی نہیں تصوراتی ہے اس لیے انیسویں صدی میں یہ بیسویں صدی کا عشق تھا جب انہوں نے کہا:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اس میں مقطع کی بات ”مجھ کو بھی پوچھتے رہو“ ہے باقی حسنِ مطلع۔

موضوعاتِ غزل کا ابدی مثلث، عاشق، محظوظ اور رقیب ہے۔ غالب کے ہاں محظوظ کا وہ احترام نہیں ملتا جو ہمارے ادب کی روایت رہی ہے۔ رقیب کو بھی وہ نہیں بخشنے۔ اپنی بوالہوی کو عشق اور بوالہوں کے عشق کو بوالہوی جانا ہے۔ کبھی محظوظ کو خدا کے ہاتھ سونپنے میں تامل کرتے ہیں اور کبھی اسے، قلب کے پرد کر دیتے ہیں۔ غالب کے محظوظ کو محترم یا محترمہ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس رندِ شاہدِ باز کے معاملاتِ حسن و عشق کے پس پر وہ اکثر کسی ”شاہدِ بازاری“ کی موجودگی کا احساس ہوا ہے۔ یہ موسط طبقے کے شخص کا عشق نہیں۔ اس میں میر صاحب کے عشق کی خستگی یا کم اور کھنک نہیں ملتی۔ یہ ”عشرتِ صحبتِ خوبی“ کا عشق ہے جس کے سامنے ”عمر طبیعی“ بھی بیچ ہے۔ کہتے ہیں:

عشرتِ صحبتِ خوبی ہی نعمتِ جانو
نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

غالب اس عیش کو شی کے باوجود عمر طبیعی پا گئے۔ تاہم ان کے خطوط اور دوسری تحریریوں میں آخر عمر کے درود رماندگی کے جو تذکرے ملتے ہیں وہ بڑے المناک ہیں۔ سجاد انصاری نے لکھا ہے کہ ان کو عقبی سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن وہ قرۃ الاعین کے قاتلوں کا حشر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ٹھنڈی میرا یمان ہے اور غالب کو ٹھنڈے رکھتا ہوں، اس لیے امید ہے کہ غالب کے قاتلوں کا حشر دیکھنے میں مجھے آسانی ہو گی۔

غائب لِ تَبَرِّعٍ لِ تَبَرِّعٍ تَبَرَّعَ لِ تَبَرَّعٍ غَرَبَتْ مُنْقَهَةٌ تَبَرَّعٍ اقبال نے عشق کی

واردات غیر ارضی یا مابعد اطبیعیاتی سطح پر پیش کی ہے۔ غالب کا عشق نہ جنسی ہے نہ رومانی، وہ حسرت و عشرت کا عشق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں حسنِ نسوانی کے مرقع نہیں ملتے۔ زلف، کاکل، نگہ، اور مژہ ہائے دراز سے قطع نظر، انہوں نے اجزاء یا اعضاءے حسن کا کہیں نہیں تذکرہ کیا ہے۔ آنکھوں کے حسن پر جبکہ متقدین اش اش کرتے ہیں، غالب سر سری گزر جاتے ہیں۔ وہن برائے بیت ہے اور لب برائے نام لیکن نگہ اور مژہ کی خلش انہوں نے ساری عمر محسوس کی ہے۔

غالب شاید اردو کے پہلے غزل گو ہیں جنہوں نے "غمِ روزگار" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ انسان کے لیے غمِ روزگار اور غمِ عشق لازم و ملزم ہیں۔ ایک جگہ تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ غم سے نجات نہیں۔ غمِ عشق کم ہے۔ نے پر بھی غمِ روزگار چھوڑ جاتا ہے۔ روزے پر ایمان رکھنا اور خانہ و برف اپنے کی آرزو کرنا مجھ سے سی بات ہے۔ جیسے روزے سے زیادہ روزی عزیز ہو۔

چہ بزراعست آزادگی خوری غالب
تر کہ ایں ہمہ با برگ و ساز باید بود

اس برگ و ساز کے لیے تگ و دو غالب کی زندگی کا ایک اہم جزو تھی۔ اسی کی خاطر انہوں نے "ہوس سیر و تماشا" کم ہونے کے باوجود سفرِ کلکتہ کی صعوبتیں اٹھائیں۔ اسی غرض سے انہوں نے کمپنی بہادر کے چھوٹے چھوٹے افروں کی مدح سرائی کی۔ ایک امید موہوم پر ملکہ و کنوریہ کے حضور میں قصیدہ پیش کیا اور تمام عمر دولت و اقبال کے سایے کو پکڑتے رہے۔ مسٹر سیسل بیڈن سے کہتے ہیں:

حیف باشد کہ زالطفِ تو ماند محروم
بچو من بندہ دیرین و نمکنوار کہیں

جیس تامن کی شان میں ایک قصیدہ نما غزل یا غزل نما قصیدہ ہے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تابویم نظر لطفِ جیس تامن است
بنزہ ام گلنین و خارم گل و خاکم چمن است

بیکسی ہائے من از صورت حالم دریاب
مرده ام بربر راه و کف خاکم کفن است

غالب اپنی حاجت کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی غیرت مند ہونے سے زیادہ حاجت مند معلوم ہونے لگتے تھے۔ عریقی صاحب کے مرتبہ خطوط نے اس نقاب کو جہاں تھاں سے اٹھا دیا ہے جو غالب کی شخصیت پر پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایسے آزاد و خود بیس کہ

اللئے پھر آئے درِ کعبہ اگر وانہ ہوا

دوسری طرف دوستوں، عزیزوں اور رئیسوں کی داد و دہش کے دروازوں کو تمام عمر کھنکھاتے رہے۔ غالب نے ایک جگہ کہا ہے کہ خدا ہاتھوں کو شرمائے یہ برابر میرے گریبان اور جاناں کے دامن کو کشاکش میں رکھتے ہیں۔ کاش کبھی وہ اس پر بھی غور کرتے کہ ان کے پانو اور چادر کی دائی کشاکش پر کون کس کو شرمائے۔ غالب معاشی پریشانیوں کے باعث بھی کبھی شعر و سخن سے اس قدر بیزار ہو جاتے کہ وہ اسے بربادی فرست سے تعمیر کرتے۔ وہ تمام عمر ایک اکبر، ایک شاہجہاں اور ایک ابراہیم عادل شاہ کا خواب دیکھتے رہے اور باوجود اس کے کہ ظہوری کے سب سے زیادہ معتقد و مدارج رہے ہیں، کہتے ہیں:

غالب به شعر کم ز ظہوری نیم ولے
عادل شہ سخن رس دریا نوال کو

سخن رسی تو ظفر کے پاس بھی تھی لیکن وہ دریا نوال نہیں ہو سکتے تھے۔ متاع و منزالت کی حرمت غالب کو تا عمر رہی۔ اس حضرت نے اردو غزل کو ایک نیا موضوع دیا ہے۔ موضوع سخن کی حیثیت سے غم روزگار کا تذکرہ غالب کی غزلوں میں کافی ملتا ہے۔ غالب کی مقبولیت کا یہ بھی ایک راز ہو سکتا ہے لیکن جب سے دنیا قائم ہے روزگار کا غم زندگی کا جزو بن گیا ہے اور ہر کس وہاں کس نے کسی نہ کسی طریقے سے اس کا اظہار ضرور کیا ہے۔ اس کی شکایت زیادہ تراصویل یا عمومی رنگ میں کی گئی ہے، اس لیے شکایت کرنے والے کو کبھی کسی نے قابل موافق نہیں قرار دیا بلکہ عام طور پر سراہا ہے۔ لیکن آلام روزگار کی شکایت کا نغمہ یا نوحہ

غالب کے ہاں اتنے اونچے سڑوں میں ملتا ہے کہ گھر کی رونق گھر کی رسوانی سے جاتی۔

غالب کی شخصیت انوکھی اور پہلو دارانہ ہوتی تو شاید ان کا کلام اس درجہ دل نشین اور فکر انگیز نہ ہوتا۔ اس تہہ دار شخصیت کے اظہار کے لیے انہوں نے بڑی جانفشاںی اور تجربے کے بعد ایک ایسی "طرح دیگر" اور ایک ایسا "انداز بیاں اور" ایجاد کیا جو آج تک اپنی مثال آپ ہے۔ حالی نے جو حکم غالب کی فارسی شاعری پر لگایا ہے وہی ان کے اردو کلام کے بارے میں دہرا یا جاسکتا ہے کہ اس قدر جامع حیثیات ادبی شخصیت نے اردو غزل کے میدان میں ظہور نہیں کیا۔ غالب کے اس فنی کمال کا تجویز یہ کچھ ہے تو معلوم ہو گا کہ ان کی عظمت کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل کی روایات سے حتی الوسع گریز کیا ہے اور اپنی فارسی دانی اور اپنی فارسی شناسی سے اردو کو ایک نئی حیثیت، ایک نئی قامت اور ایک نیا لہجہ بنخشا۔ ان کے کلام میں موضوعات کا تنوع ہے اور ہر موضوع کے اظہار میں ان کا مخصوص طرز بیان کا رفرما ہے۔ ضمناً یہاں بھی یہ یاد رکھیے کہ غزل بجائے خود موضوعات کے تنوع کی جنت ہے۔ غالب کے یہاں اقبال کی طرح مباحث یا مسائل کا تنوع نہیں ہے، نہ ان پر قطعی اور ترشے ہوئے فیصلے ہیں جن کو دیکھ کر یہ کہنا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ بات کسی شاعر نے کہی ہے یا مفکر، مقتن، مجدد یا مہاتمانے۔

غالب کے یہاں جذبے کی شدت یا حرارت تو نہیں ملتی جو میر کی شاعری کی جان ہے لیکن غالب کا بہترین کلام جذبے سے عاری نہیں۔ یہ جذبہ خیال کے تہدار نقاب میں نمودار ہوتا ہے۔ مثلاً:

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں انتہا ہے
شعلہ عشق یہ پوش ہوا میرے بعد

بظاہر اور بعض ایسے شارحین کے نزدیک جو محض صنائع بدائع کے متلاشی و معروف ہوتے ہیں، غالب نے یہ شعر شمع، شعلہ، دھواں اور سیاہی کے تلازمے کی خاطر کہا ہے یعنی شعر کی پرداخت تمام تر خیالی ہے لیکن دراصل غالب نے اس پوری غزل میں اپنے مرتبہ عاشقانہ کا اظہار بڑے ہی بھر پور، دل دوز اور دل نشیں انداز اور لمحے میں کیا ہے۔ اس

قبیل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونپکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

روایتی شارح یہ کہہ رہ آگے بڑھ جائیں گے کہ مرزا صاحب نے حکایت اور قلم کی خوب رعایت رکھی ہے لیکن یہ شعر صنعت گری کی خاطر نہیں لکھا گیا ہے۔ اس کے پیچھے جنون غالب اور عشق غالب کا احساس ملتا ہے اور ایک عظیم منصب کو ادا کرنے اور کرتے رہنے کا جذبہ اور حرارت ملتی ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا صحیح نہ ہو گا کہ غالب محض خیال اور فکر کے شاعر ہیں، جذبے کے نہیں۔ عظیم غنائیہ شاعری میں جذبے کی گرمی نہیں، روشنی ملتی ہے اس کا احساس غالب کے ان اشعار میں بھی ہوتا ہے جو خالص فکری کہے جاسکتے ہیں مثلاً:

ہیں آج کیوں ذیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئندہ ہر دم نقاب میں
غالب کی غزلوں کی ندرت ان کے فکری لمحے میں ہے۔ ان کو فلسفی نہیں کہہ سکتے
اس لیے کہ ان کے ہاں اقبال کی طرح کوئی منظم فکر نہیں ملتی۔

غزل میں فلسفہ یا منظم فکر یا پیام نہ ملے تو یہ غزل کو کا قصور ہے نہ غزل کا۔ غزل اس قسم کی کوئی چیز قبول نہیں کرتی۔ اس کی یہ روایت بھی نہیں ہے۔ اردو کو منظم فکر کی شاعری اقبال کی دی ہوئی ہے۔ غزل میں زیادہ تر شاعر کا "موڈ" ملتا ہے۔ موڈ جلد بدلتا رہتا ہے، فکر نہیں بدلتا۔ موڈ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ فکر طرح طرح کی پابندی اور جواب دہی کے نرغے میں ہوتی ہے۔ بعض شاعروں میں موڈ نسبتاً زیادہ طویل ہوتا ہے، جسے ہم غلطی سے فکر یا "پیام" کا درجہ دے دیتے ہیں۔

غالب کی مابعد الطبيعیاتی سطح وہی وحدت الوجود کی سطح ہے۔ استعارے اور تلاز میں بھی وہی ہیں جو اس حقیقت کے اظہار کے لیے فارسی اور اردو شعر اعرصے سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ مثلاً دریا اور قطرے کی نسبت، شمع و پروانے کی نسبت، ذرہ

اور صحرائی نسبت، پر تو خور اور شبتم کار شتہ۔ انہوں نے مظاہر کی حقیقت کو بھی "حلقة دامِ خیال" سے تعبیر کیا ہے اور کبھی "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے" کہہ کر ختم کر دیا ہے۔ فلسفی سے زیادہ ان کو اپنے ولی ہونے پر اصرار ہے۔ اردو اور فارسی دونوں دو اوین میں یہ دعوای موجود ہے۔ میں غالب کی ولایت کا قائل نہیں ہوں اس لیے اور کہ آپ بھی میرے ہموا ہیں۔ والی مملکتِ خن وہ یقین ہیں اور اس مملکت میں انہوں نے فرماں روائی ہوش و خرد کے ساتھ کی ہے۔ غالب سے پہلے اردو غزل یا تور و لیاتی تھی یا میر جیسے اچھے اور پچ شاعروں کے یہاں "جراحتوں کا چمن" تھی۔ غالب نے پہلی بار اسے فکر کا انداز اور لمحہ بخشا۔ سہی ندرستِ غالب ہے اور اسی میں غالب کی عظمت پوشیدہ ہے۔ شعر غالب کی شخصیت کا اظہار ہے۔ ان کی شخصیت پنج درجع تھی، اس لیے ان کے اشعار پہلو دار ہیں۔

فنونِ لطیفہ میں فن کوئی بندھان کا ٹکنیکل یا میکانکی عمل نہیں ہوتا۔ ہر فنکار اپنا فن ساتھ لاتا ہے۔ غالب ایک چاک دست فنکار ہیں وہ شعر نہ تور عایت لفظی کی خاطر کہتے ہیں نہ صنعت گری اور باز گیری دکھاتے ہیں۔ لیکن بات کہنے اور سامع کے دل میں اتارنے کا ذہب ان کو خوب آتا ہے۔ وہ علم بلاught کے تمام تصحق و ترصیع کو موقع محل کے لحاظ سے بر سر کار لاتے ہیں۔ انہوں نے ایسی صنعتیں استعمال کی ہیں جن کا لتب بلاught میں کوئی نام نہیں جیسے بھوکے وہ عشوے جن کو کوئی نام نہیں دیا جاسکا ہے۔ اسی سبب سے ان کا ہر لفظ "نَجْيَةٌ مَعْنَى" کا طسم ہوتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ ابہام کے کتنے اقسام ہیں۔ کب شعر کے لیے یہ زلف گرد کیر کا حکم رکھتا ہے اور کب زنجیر پابن جاتا ہے کہتے ہیں:

میرے ابہام پڑھتی ہے تصدق توضیح

میرے ابھال سے کرتی ہے ترشیح تفصیل

لفظوں کے استعمال کا جیسا غیر معمولی شعور غالب کو ہے اردو کے بہت کم شعرا کو ہے۔ ایک طرف ان کو فارسی فرنگ و آہنگ پر عبور، دوسری طرف دلی کے روزمرہ اور محاورے پر دسترس۔ اس طرح وہ ایک نئے انداز سے بساطِ شعر آرائتے کرتے ہیں روزمرہ کے واقعات سے اپنے اشعار میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً

ہر ایک بات پر کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے تمحیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

کہا تم نے کہ ”کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسائی“

بجا کہتے ہو ج کہتے ہو پھر کہو کہ ”ہاں کیوں ہو“

نکتہ چیس ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے باتِ جہاں بات بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتشِ غالب

کہ لگائے نہ گئے اور بجھائے نہ بنے

یہ اشعار اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ غالبِ کودتی کے روزمرہ پر کتنا غیر معمولی عبور تھا۔ لیکن غالب کی اردو نہ تو قلعہِ معلقی کے اکابر کی وہ شوخ و شنگ اردو تھی جس کا نمونہ داغ کی شاعری میں ملتا ہے، نہ دلتی کے بازاروں اور کرخنداروں کی اردو غالب کی اردو خوش نوایاں اور شرفاۓ دہلی کے ایوانوں اور محل سراوں کی اردو تھی۔

آپ کے علم میں ہو گا، غالب نے اپنے ایک خط میں لفظ ”تیس“ پر جسے دہلی والے اس وقت بھی بولتے تھے اور آج بھی ان کی زبانوں پر رواں ہے، کس برہمی و بیزاری کا اظہار کہا ہے۔ وہ اس لفظ کو نہ صرف متروک بلکہ مردہ قرار دیتے ہیں۔ غالب نے اردو خطوط نہ لکھے ہوتے جب بھی ان کے اردو کلام میں روزمرہ اور محاورے پر جو قدرت ملتی ہے، صرف اس سے ان کی غیر معمولی قدرت بیان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے وہ بھی گر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے یہ جانتا اگر تو لٹاٹا نہ گھر کو میں
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں نہ سہی عشقِ مصیبت ہی سہی
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین ودلِ عزیز اس کی گلی میں جائے کیواں

رہا گر کوئی تاقیامت ساامت۔ پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت ان اشعار میں دہلی کا بھر پور لجھ ملتا ہے۔ ایسی سادگی جس میں پُر کاری بھی ہے، ایسی پُر کاری جو الفاظ سے نہیں بلکہ لجھ کے اتار چڑھاؤ سے برآمد ہوتی ہے۔ روزمرہ اور محاورے سے کھیلنا اور کھلانا اردو شعر اکا ہمیشہ سے بڑا محبوب مشغله رہا ہے جیسے روزمرہ اور محاورہ ہی شاعری کا مقصد اور زبانِ دانی کا معیار رہ گیا ہو۔ غالب نے روزمرہ کو کلیتہ اپنادست نگر کھا ہے، اس کے دست نگر کہیں بھی نہیں ہوئے۔

حالی نے غالب کی فارسی نظم و نثر پر حکم لگاتے ہوئے لکھا ہے کہ امیر خروہ کے بعد اس باب میں ایسا صاحب کمال سرز میں ہند سے اٹھا ہے نہ اٹھے گا۔ فارسی کے بعض مبصرین کا خیال ہے کہ غالب کے فارسی مکاتیب کے تبصرہ و تحسین پر اب تک خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ میری ماہرانہ ہر گز نہیں لیکن نیاز مندانہ رائے ہے کہ فارسی میں غالب کا اصلی کمال ان کی مشنویات اور قصائد میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی فارسی غزلیں اپنے تنوع اور شاعرانہ ابلاغ کی وجہ سے ظہوری کی غزاوں سے یقیناً زیادہ کامیاب ہیں۔ اس اعتبار سے ظہوری خفائی اور غالب ظہوری ہیں۔ تمام وہ اب تک ابل زبان کی نظر میں کچھ زیادہ وزن و وقعت نہیں حاصل کر سکے ہیں۔ غالب مبد آفیاض سے فارسی زبان میں چاہے جس قدر دستگاہ یا آتشکدہ ایران سے شعلہ و شر رائے ہوں، تھے وہ عبد اللہ کے بیٹے اور کمیدان غلام حسین کے نواسے۔ بچپن خود ان کے بیان کے مطابق ابتو ولعب میں گزر ا۔ ایسی صورت میں فارسی غالب کی اکتسابی زبان تھیں۔ اکتسابی زبان میں لکھنے والا اہل زبان کی نظر میں کچھ زیادہ قیع نہیں ہوتا۔ شاعری زبان کا بڑا ہی لطیف اور ماہرانہ عمل ہے۔ اس میں ہر لفظ کے معنی و معنویت اور محل و موقع کا بڑا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ سبک ہندی کے پیر و تاریخ ادبیات ایران میں اب تک کوئی قابل لحاظ مقام حاصل نہیں کر سکے ہیں اس لیے یہ کہنا پڑے گا کہ یہ غالب کا "بیرنگ مجموعہ اردو" ہی ہے جس کی بنیاد پر ان کے شعر کی شہرت گیتی میں قائم ہے۔ کہا معلوم اپنے آخری دور میں انہوں نے یہ محسوس بھی کیا ہو جبھی تو کہتے ہیں:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکے ہور شک فارسی
 گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں
 غالب ذولسانی (اردو اور فارسی کے) شاعر تھے۔ ابتدائی کلام زیادہ تر اردو کا ہے۔ دوسرے
 دور سے فارسی شاعری پر خاص توجہ ملتی ہے۔ ذولسانی شاعر ہونے کی حیثیت سے اس بات
 کا امکان تھا کہ ان کی دونوں زبانوں کی شاعری میں شامل اشعار کثرت سے ملتے۔ تعجب
 ہے کہ ایسا نہیں ہے سو اگنے پنے چند اشعار کے جو پیش کیے جاتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کی
 دلچسپی کا باعث ہوں:

(۱) اندرال روز کہ پرش رو داز ہر چہ گزشت

کاش باما خن از حرست مانیز کنند

ناکرده گناہوں کی بھی حرست کی ملے داد

یا رب اگر ان کرده گناہوں کی سزا ہے

(۲) ہائے ایں پنجہ کہ باجیب کشاکش دارد

بود بادامنِ پاکت چہ قدرہا گستاخ

خدا شرمئے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں

کبھی جاناں کے دامن کو کبھی میرے گریباں کو

(۳) گلے بر گوشہ دستار داری

خوش بخت بلندِ باغباناں

ترے جواہر طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں

ہم اونچ طالع لعل و گھر کو دیکھتے ہیں

یا

گوہر کو عقدِ گردنِ خوبی میں دیکھنا

کیا اونچ پر ستارہ گوہر فروش ہے

(۴) دیگر ز ساز بے خودی ما صدا مجھے
آوازے ازگستان نار خودیم ما
نہ گل نغمہ ہوں نہ پرده ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
شکست رنگ تو از عشق خوش تماشا یکیت
(۵) بہار دہر بر گنینی خزان تو نیست
ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے
لالہ و گل و مداد از طرف مزارش پس مرگ
(۶) تا چہادر دل غالب ہوس روے تو بود
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنهان ہو گئیں

لیکن ایسے اتفاقات کم ہیں ورنہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دو غالب تھے۔ ایرانی نژاد اور ہندی نہاد۔ لسانی اور معنوی اعتبار سے اُن کی فارسی میں کلاسیکی توانائی اور طنفہ ملتا ہے۔ لبجہ عام طور پر فکری ہے۔ استوار و ہموار۔ فارسی شاعری میں بے تکلف ہونے کی بُرات نہیں کرتے۔ اردو میں اتنی احتیاط یا احترام ملحوظ رکھنا شاید ضروری نہیں سمجھتے۔ اردو کلام میں وہ جتنے بے تکلف نظر آتے ہیں اتنے ہی فارسی میں با ادب ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مادری زبان اور اکتسابی زبان میں شاعری کرنے کا کیا فرق ہے اس لیے غالب کے فارسی کلام میں چاشنی نہیں ملتی۔ اس کے بر عکس اردو میں روزمرہ کی لذت اور طنز و مزاح کا بانگمپن ہے۔ فارسی کے اہل زبان تو یہاں تک کہتے ہیں کہ غالب کے ہاں جا بجا روز مرہ سے انحراف بھی ملتا ہے۔ غالب کتنا ہی کہتے رہیں:

بو، غالب عندليب ازگستانِ جم
من ز غفلت طویں ہندوستان نامید دمش

ہیں وہ طو طی ہندستان، ہی۔

اپنے عصر کے جمالیاتی فکر کے مطابق غالب بھی شعر کا الہامی تصور رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاعرانہ مضامین غیب سے خیال میں آتے ہیں لیکن اس بنیادی تصور کے ساتھ ساتھ ان کو بہیت کا پوری طرح شعور تھا۔ اپنے خطوط میں انہوں نے لفظوں کے تعینِ مفہوم سے بار بار بحث کی ہے اور نئے نئے نکتے پیدا کیے ہیں۔ ہر چند وہ صحیح معنوں میں لغت نویس نہیں تھے اور برہان قاطع کے سلسلے کی بحث میں پڑ کر اپنی عزت و شہرت کو خطرے میں ڈالا تاہم لغت شعر پر ان کی بڑی اچھی نظر تھی۔ لفظ کی اس اہمیت کے باوجود غالب کی جمالیاتی فکر ”ماوراء لفظ“ کی قالل تھی۔ معنی ان کے نزدیک پیکر لطافت تھے اور لفظ پیکر تحریر۔ اس لیے اکثر معنی پیکر تحریر میں نہیں ڈھالے جاسکتے ہیں۔ کہتے ہیں:

خن ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر
نہ شود گرد نمایاں زرم تو سن ما

ان کا یہ خیال صحیح ہے کہ شعر اپنی انتہائی لطافت میں ذوقیات سے تعلق رکھتا ہے، تشریفات سے نہیں۔ مولوی کرامت علی کو ایک شعر کے بارے میں لکھتے ہیں ”اس شعر کا لطف وجود انی ہے بیانی نہیں“ لفظ و معنی کے اس باہمی ربط کو پیش نظر رکھتے ہوئے منشی ہر گوپاں تفتہ کو لکھتے ہیں۔ ”بھائی شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیانی نہیں۔“

غالب فنِ شعر کی ترقی کے لیے سازگار ماحول ضروری سمجھتے تھے۔ تفتہ ہی کو لکھتے ہیں: ”زیست بسر کرنے کے لیے کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہیں۔“ ان کی شاعری کے اصل حرکات ”مضمون آفرینی“ اور ”ذوقِ نواخجی“ ہیں۔ بعض اوقات ”رعنائی خیال“ کا محور کوئی شخص بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

تمی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

رعایتی خیال کی تہہ میں ایک ماذی شخصیت اور وجود کی موجودگی، غالب کے تخلیقی عمل کو حائل کے اس قول کے تابع کر دیتی ہے کہ ہر خیال کی تہہ میں کسی ماذی بنیاد کا ہوا ضروری ہے " غالب کی جمالیات میں جذبے پر ہر خیال کو فوقيت حاصل ہے۔ لفظِ خیال سے مرکب تراکیب کا غالب نے کثرت سے استعمال کیا ہے۔ یہی قوتِ متخیلہ غالب کو مضمون اور معنی آفرینی کی جانب کھینچتی ہے۔ اس کی ترجمانی "متنانہ طے کروں ہوں رہ وادی خیال" میں ملتی ہے۔

غالب کو اپنی فارسی دانی پر بڑا ناز تھا۔ تفتہ کو لکھتے ہیں۔ "فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و صوابط میرے خمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔" مفتی میر عباس کو لکھتے ہیں: "فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازی و سرمدی لایا ہوں" غالب غلطِ العام کے قائل نہ تھے۔ کہتے ہیں: "اپنا ذوق فارسی اور مسلک، خلافِ جمہور" اردو غزل میں جنم کا خسنِ طبیعت غالب کا عطیہ ہے لیکن اس ذوق فارسی کے ساتھ ساتھ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا ہے غالب کا سانی ما حول شرفائے سے دہلی کا تھا جہاں قلعہ معلیٰ کا محاورہ رائج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نہایت شستہ اردو میں مکتوب نگاری کر سکے۔ اردو شاعری کو اپنی فارسی دانی کے اثر سے نہ بچا سکے لیکن رقعات میں فارسی انشاء کا مطلق اثر نہیں ملتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مبداء فیاض سے فارسی میں دستگاہ ملی ہو یا نہیں اردو قواعد و صوابط ان کے خمیر میں اس طرح پیوست تھے جیسے فولاد میں جوہر۔ اردو میں انہوں نے نہ صرف غلطِ العام بلکہ غلطِ العام سے بھی پرہیز کیا۔

غالب نے اپنے بدیکی یا ولایتی (سلجوق ترک) ہونے کے امتیاز اور اپنی ناقدِ ری کے احساس کا اظہار بار بار اور طرح طرح سے کیا ہے۔ یہ موضوع ایک حد تک ان کے کلام اور لب و لبجھ کی پہچان بن گیا ہے، ان کا خسن بھی۔ سوال یہ ہے کہ اگر غالب ہندستان کے بجائے اپنے اسلاف کے دربار میں پیدا ہوئے ہوتے اور ہندستان سے اتنے ہی دور اور بے گانہ ہوتے جتنے کہ تین چار پشت پہلے ان کے قبیلے کے بزرگ تھے تو غالب وہی غالب

ہو سکتے یا نہیں جو ڈیڑھ سو سال سے ہمارے سامنے ہیں اور آج تمام مہذب ممالک میں ان کی شاعری اور شخصیت پر اہل فکر و نظر عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کے فارسی کلام کے بارے میں اس سے پہلے گفتگو آچکی ہے۔ عجم جس سے نسبت رکھنے پر ان کو اتنا اصرار ہے ان کی فارسی اور فارسی کلام کو وہ درجہ نہیں دیتا جس کا دعوایا ارمان غالب کو رہا۔ میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ یہ اعرابی (غالب) ہندستان آکر کعبہ تک پہنچ سکا ورنہ ترکستان یا ترکستان کے راستے ہی میں کہیں رہ جاتا۔ غالب کی جیہیں کو اگر اردو اپنے تمام حسن و ہنر کے ساتھ نہ ملی ہوتی اور مغل تہذیب کا عظیم ورشہ اردو شعروادب کی آز مودہ روایات اور اس کا مخصوص تاریخ پود نیز دہلی کا سخت گیر شایستہ سماج نصیب نہ ہوا ہوتا تو غالب اردو شاعری اور مکتب نگاری میں ”شہرت عام اور بقاءِ دوام“ کا درجہ شاید حاصل نہ کر سکتے۔ اس طور پر غالب کا اردو شاعری پر جتنا احسان ہے اس سے کچھ کم احسان اردو شعروادب کا غالب پر نہیں ہے۔ بات چھڑ جاتی ہے تو سلاسلِ رد عمل (CHAIN REACTION) کی زد میں آکر قیامت یا کسی کی جوانی تک ضرور پہنچتی ہے۔ چنانچہ غالب کے بارے میں اگر اردو اور دہلی ایک کتر جنمی (فردوسی) کی لفتار کو دہرا دیں تو یہ جانہ ہو گا یعنی غالب کو ہم نے رسم داستان بنادیا و گرہ وہ سیستان کے ایک معمولی پہلوان تھے اور وہ ہیں رہ جاتے۔

فردوسی نے شاہ نامہ لکھ کر کہا تھا ”عجم زندہ کردم بدیں پارسی“ اسی اعتقاد و افتخار سے غالب کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اردو کلام سے فارسی کو ہندستان میں زندگی نو بخشی۔ اس طرح ہندستان اور ایران کی تاریخی و تہذیبی یکجہتی کو محکم تر اور مقبول تر کر دیا۔ غالب نے شاہ نامہ تو نہیں تصنیف کیا لیکن اردو میں فردوسی کے ظہور کے امکانات پیدا کر دیے۔ اس طور پر یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے فارسی کی بڑی معتبر سفیر اردو ہے، فارسی ہی کی نہیں اپنے ملک کی زبانوں کی بھی!

ایک بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ ہندستان اور ایران کی کلائیکی مشنویوں کا علم رکھتے ہوئے غالب کوئی بلند پایہ مشنوی فارسی یا اردو کو کیوں نہ دے سکے۔ فردوسی نظامی، خرسو، جامی، کی روایات ان کے سامنے تھیں۔ ایسی مشنوی کے لیے جس قدرتِ

شعری اور قوت متحیله کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی غالب میں بیش از بیش تھی البتہ عقیدہ عمل کی اس تپش و توائائی کی کمی تھی جو بالعموم مذہب اور ماوراءیت کی دین ہوتی ہے اور جس کے بغیر بڑے کام انجام نہیں پاتے۔ غالب میں عصیت تھی، عینیت (آئیڈ لزم) نہ تھی۔ کبھی کبھی اغراض کو اقدار پر ترجیح دی جائے۔ انہوں نے فارسی میں محدود و مختصر مشنیات تصنیف کی ہیں جو اپنی جگہ پر خوب اور بہت خوب ہیں۔ ان میں سے ایک بیان معراج میں بھی ہے۔ اس میں جہاں تھاں مولود شریف کا انداز آگیا ہے اور یہی وہ چیز تھی جس کی غالب سے کم سے کم توقع کی جاتی تھی۔ معراج پر لکھنے کا غالب کو حوصلہ بھی تھا اور صلاحیت بھی لیکن جن مکروہات و مصائب میں وہ بتلا ہو گئے تھے، ان سے نجات پاسکے نہ ان سے عہدہ برآ ہو سکے۔ معراج دراصل مجاهد مفکر اور صاحب یقین کا موضوع ہے۔ جب تک شاعر یا فنکار میں یہ تینوں صلاحیتیں موجود اور برابر عمل نہ ہوں گی، اس موضوع پر کوئی بڑی لظم (مشنوی) نہیں لکھی جا سکتی۔ مذہب و ماوراءیت سے قطع نظر غالب اگر انحراف عظیم یا انکار ابلیس پر کوئی مشنوی تصنیف کر سکتے تو یقیناً ان کی غزلوں سے وہ کم مقبول نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ اردو مشنوی کی قدر و قیمت میں جو گراں بہا اضافہ ہوتا اس کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

مگر غالب بھی کیا کرتے قدیم مشنویوں کی رزم اور بزم کی داستانوں کے لئے جس طرح کی اساطیری فضام فوق الفطرت کردار، اور ان کے محیر العقول کارناے ساز گار ہوتے تھے، اب ان کے لیے کوئی گنجائیش نہیں رہ گئی۔ انسان نے خارج پر اتنی قدرت حاصل کر لی ہے کہ تخلیل کی عجوہ تراشی کا کیا ذکر، ماہ و مربع کی تسبیح میں بھی اب کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے۔ پہلے تخلیل کی مدد سے جہاں پہنچتے تھے اب وہاں سے بھی آگے مشین میں بینہ کر پہنچ جاتے ہیں۔ کبھی تخلیل کی پیرو مشین تھی، اب مشین کی گرد را تخلیل ہے۔ باہمہ مذہب اور ماوراءیت کی وسعتوں میں انسان کی رفت و رفah کے ایسے سرچشمے ملتے ہیں جن سے شاعری و شخصیت ہمیشہ شاداب و تازہ کار رہے گی۔ خارج ہمیشہ تسبیح ہوتا رہے گا۔ باطن ہمیشہ تجسس کا محرك اور تسلیم کا موجب رہے گا۔ ”آنکہ یافت نشد آنم

آرزوست“ میں یہی رمز اور بشارت پوشیدہ ہے۔

کسی شاعر اور اس کی شاعری کے حسن اور افادے کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ ہر طرح کے لوگ ہر طرح کے موقعوں پر کس بے ساختگی اور کثرت سے اس کے اقوال کو معرضِ گفتار میں لاتے ہیں۔ ضرب الامثال اسی طرح بنتے ہیں اور پھر نہیں مٹتے چنانچہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ عام طور پر جتنے اشعار مصرع فقرے اور تراکیبِ اقبال اور غالب کے کلام سے ہماری تحریر و تقریر میں بے اختیار آتے ہیں وہ کسی دوسرے اردو شاعر کے نہیں آتے۔ اقبال و غالب یا غالب اور اقبال کے بعد میر ہیں۔ اس کے بعد بقیہ اور کس شاعر کے اشعار یا مصرع ضرب الامثال کے طور پر زبان پر رواں ہوتے ہیں اس کا دار و مدار اس پر ہے کہ سوسائٹی پر کس طرح کے شاعر اور شاعری کی گرفت ہے۔ ایک زمانے میں داعٰؑ اور امیر اور ان کے قبلے کے شاعروں کے کلام سے سوسائٹی متاثر تھی، اس لیے ان کے اشعار اور مصرع زبان پر آتے تھے۔ اس کے بعد معاشرے کا مذاق بدلا اور بلند ہوا تو غالب اور اقبال کو قبول عام نصیب ہوا۔ غالب اور اقبال کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو سماج پر ان کی گرفت بڑھتی رہے گی اور ہا معلوم مدت تک باقی رہے گی اس لیے کہ بحیثیت مجموعی اردو شعروادب کا معیار کافی بلند ہو چکا ہے اور اس کے مزید بلند ہونے کا مدار اس پر ہے کہ اردو میں غالب اور اقبال سے بڑا شاعر کب پیدا ہوتا ہے۔ مستقبلِ قریب میں تو نظر نہیں آتا۔

کسی شاعر کے شعر، مصرع یا فقرے کا ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لینا اس کے معاشرے کے ہر چھوٹے بڑے کی طرف سے اس کے لیے بڑی گرانقدر تحسین ہے جس کا حاصل کر لینا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ غالب کو ایک مخصوص و مہتمم بالشان امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ اربابِ فن و فلکرنے اپنے کلام تصانیف یا تالیفات کے لیے اپنی پسند کے جتنے نام غالب کے کلام سے چنے ہیں کسی اور کے کلام سے نہیں۔ یہ نام کلیتاً غالب کے اردو کلام سے لیے گئے ہیں لیکن ترکیب آہنگ اور فرہنگ کے لحاظ سے تمام تر فارسی ہیں۔ حالانکہ اردو میں فارسی کی غیر معمولی آمیزش کے لیے غالب خاص طور پر

بد نام ہیں دراصل غالب حائل اور اقبال نے ہمارے ذوق اور ذہن کو اردو شاعری سے ایک نئی وابستگی اور اس کا ایک نیا انتشار بخشت۔ ان سے ہم کو ایک نیا عہد نامہ ملا ہے۔ اس کی بنابر کہا جاسکتا ہے کہ ہماری شاعری کا معیار برابر اونچا ہوتا رہے گا، پست کبھی نہ ہو گا۔ شاعری ہی کا نہیں ہماری رزم و بزم کا بھی۔

اس معیار و میزان کے پیشِ نظر جب ہم ان شاعروں اور ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں جنہوں نے گذشتہ ۳۰-۳۵ سال سے شاعری کے تصورات اور شعر کی بہیت اور مطالب کے اظہار و ابلاغ کے نئے راستے اور نئے وسیلے پیش کیے ہیں اور کرتے رہے ہیں تو معلوم ہو گا کہ ضرورت کے وقت ان کا کلام ہماری مدد نہیں کرتا، نہ لکھنے میں نہ بولنے میں، نہ سوچنے میں، نہ یاد رکھنے یاد آنے میں۔ پڑھیے تو فوتِ فرصتِ ہستی کا غم دامنکیر ہو جاتا ہے۔ اس کمی کی کہیں اور کوئی اہمیت ہو یا نہیں اردو سماج اور شعر و ادب میں اب تک یہ بہت بڑی کمی سمجھی گئی ہے۔ کسی شاعر کے صحتِ مندِ تخیل افروز اور فکر انگیز ہونے کی ایک شناخت یہ ہے کہ اس میں کم سے کم شعر ہوں اور ان کا کلام پسند کرنے والوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہو، نہ کہ اس کے بر عکس۔

خدا، عورت اور شراب ان چند موضوعات میں سے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے میں اچھے شاعر کو بڑی آزمائیش سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ ایسے پلِ صراط ہیں جن پر سے عافیت و عزت سے گزر جانا آسان نہیں۔ پلِ صراط آخرت ہی کا نہیں اس دنیا کا بھی مسئلہ ہے شاید اہم تر اور نازک تر! اپنے اپنے منصب اور مسائل کے اعتبار سے ہر شخص ہر لحظہ اس سے گزرتا اور انعام یا عبرت سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ ان موضوعات پر کسی شاعر کے دوچار شعر بھی سن لوں تو ثواب یا گناہ سے قطعِ نظر یہ بتاسکوں گا کہ اپنے ذوقِ ظرف اور ذہن کے اعتبار سے وہ کس پایے کا شاعر ہے۔ ہمارے شاعروں کا دیرینہ رشتہ خدا سے سنا جاتی یا سائلانہ رہا ہے اور موجودہ دور میں استہزاً یا یا حفظِ مراتب سے بیگانگی کا۔ عورت سے سستی تفریح و تعیش اکثر تخفیش کا۔ نوجوان شعر ایسے سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ خدا سے انحراف یا انکار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ عورت، ادب معاشرے اخلاق اور اقدار

سب کے تقاضوں کو اپنے نفس کے تقاضوں پر قربان کر دیں۔

خدا اور انسان کا رشتہ خالق و مخلوق کا یقیناً ہے۔ بعض کے نزدیک آقا اور غلام کا ہوتا سے بحث نہیں لیکن ان کے علاوہ اور ان سے علاحدہ ایک رشتہ اور ہے یعنی انسان کا اس دنیا میں اللہ کے نائب ہونے کا۔ ایسا نائب جو اقتدار اعلاء کے جبر و قهر کا اتنا نہیں جتنا اس کی عظمت حکمت اور رحمت کا نمایندہ اور نمونہ ہے۔ وہ خدا کی دی ہوئی استعداد یا اختیار کی بنا پر اس کے حضور میں تقدیر انسان اور لظم جہان پر اپنے اثرات و رؤ عمل کا اظہار کرنے کا مجاز ہے۔ خدا کا منشاء یہ نہ ہوتا تو اس نے انسان کو ان اعلاء صفات سے سرفراز نہ کیا ہوتا جو صرف اسی میں پائی جاتی ہیں۔ غالب کے ہاں پہلی بار خدا ہما تصور اپنے پیشروں سے ہشا ہوا ملتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے جو خدا کے نائب یا نمایندے کا ہونا چاہیے۔ وہ خدا کی عظمت حکمت و رحمت کا اتنا لحاظ یا احترام نہیں کرتے جتنا اپنی ذاتی حرمت اور محرومیوں کا ماتم کرتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر ان کے یہاں اکثر وہ سطح اور لب و لہجہ نہیں ملتا جو اس طرح کے کلام میں لازم آتا ہے۔ غالب جبر پر طعن کرتے ہیں اختیار کا حق ادا نہیں کرتے۔ بڑا شاعر جبر کو اختیار قرار دے کر چیلنج دیتا بھی ہے قبول بھی کرتا ہے۔ یہ بات ہم کو اقبال کے یہاں ملتی ہے۔

غالب کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لکھا کرے کوئی احکام طالع مواد
نقل کرتا ہوں اُسے نامہ اعمال میں میں
کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ با مید گزر جائے گی عمر
ہوں منحرف نہ کیوں رہ ورسم ثواب سے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
نفریں و خود پسند، بہ پیغم چہ میکنی
یا رب بدھر بچو تو تی آفریدہ باد
اُردو شاعری پر غالب کے جو احسانات ہیں ان سے قطع نظر ان کی غیر معمولی شخصیت اور
شاعری کا یوں بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے شراب کو اُردو شاعری میں وہ درجہ

دیا جو ہمارے شراب اب تک نہ دے سکے تھے۔ شراب کا تصور پی کر بہک جانے میں تھا، اکثر بے پیے بیکنے کا۔ بد اطوار ہونے اور بے آبرو کرنے کا بھی۔ بعضوں نے شراب کی تطبیق تصور سے کرنی چاہی یا تصور کی گفتگو میں بادہ و ساغر کا جواز پیش کیا لیکن یہ دونوں کسی سطح پر ایک دوسرے سے سازگار نہ ہو سکے۔ تضاد میں توافق پیدا کرنے کی کوشش یوں بھی نہ خوش نیتی ہے نہ عقل مندی۔ تجرب نہیں حشر میں شراب خدا سے شکایت کرے کہ اس کو قبل از وقت ایسے لوگوں میں اتارا گیا جن کونہ مناسب ظرف نصیب ہوا تھا نہ ذوق۔ شراب پر کم شعر و ادب میں ایسے بے مثل اشعار میں گے جیسے غالب نے کہے ہیں۔ اس پا یہ اور اس انداز کے اشعار نہ غالب کے فارسی کلام میں ملتے ہیں، نہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں دیکھنے میں آئیں گے۔ یہ اشعار صرف غالب کہہ سکتے تھے، اردو میں کہہ سکتے تھے اور دہلی میں کہہ سکتے تھے جو اُس عہد میں غالب اور اردو کا مجموعہ تھی۔

ملاحظہ ہوں:

گوہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تودم ہے رہنے دو ابھی ساغر وینا مرے آگے جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں پھر دیکھے اندازِ محل افسانی گفتار رکھ دے کوئی پیانہ و صہبا مرے آگے ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم ہر شب پیاہی کرتے ہیں۔ میں جس قدر ملے پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تودے ہے دو قدم وجہ پریشانی صہبا یکبار لگا دو خم میں میرے لبوں سے کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ہے یوں کہ مجھے ذرود تھہ جام بہت ہے غالب کے ہاں خدا، شراب اور وہ خود ہیں۔ عورت نہیں۔ اقبال کے یہاں ایک اور چیز بھی ہے یعنی تصور ابلیس جس کا ذکر یا عمل دخل ہماری شاعری میں رسمی اور روایتی رہا ہے یعنی مسلسل اور آنکھ بند کر کے اس پر لعنت صحیحہ رہنا۔ اقبال نے شیطان کو قابل لعنت نہیں قابل لحاظ بتایا۔ اردو شاعری میں اقبال پہلے شاعر ہیں جس نے انسان اور شیطان کو اُس زاویے اور سطح سے پیش کیا جو مصالحِ خداوندی اور عظمتِ انسان سے قریب و قرین

تحا۔ اقبال نے خدا، عورت، انسان اور شیطان کو اردو شاعری سے جس طرح متعارف کیا، اس سے ہمارے ادب، ہماری زندگی اور ہمارے سوچنے اور محسوس کرنے میں بڑا گراں قدر انقلاب آیا۔

اس دنیا میں خدا کی نیابت جس طرح انسان نے کی ہے یا اس کو کرنا چاہیے تھا اور جو اصل منشاءِ الہی اور تخلیق آدم تھا، نیز انسان کی وکالت خدا کے حضور میں جس شایانِ شان طریقے اور لب و لبجے سے اقبال نے کی وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے جس میں اقبال کا مثل شاید ہی کسی اور شعر و ادب میں نظر آئے۔ اس طرح اقبال نے انسان کی فکر و نظر کو ایک نئی وسعت اور اردو شعر و ادب کو ایک نئی و قوت ذمے داری اور روایت بخشی۔ اردو شاعری میں اقبال کے کلام نے وہ کیا جو کسی امت میں صحیحہ آسمانی کے نزدیل سے دیکھنے میں آیا ہے۔ ان کا کلام اردو شاعری کے معیار کو کبھی گرنے نہ دے گا۔ اردو شاعری میں چاہے جتنے انقلاب آئیں معیار وہی طلب کیا جائے گا جو اقبال کے کلام نے قائم کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عورت کا تصور حالی اور اقبال نے عفت عزت اور عظمت کی جس سطح سے پیش کیا وہ کسی دوسرے اردو یا فارسی شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ غالب حالی اور اقبال کے بارے میں جو باتیں عرض کی گئی ہیں ان کو ذہن میں رکھ کر آج کل کی اردو شاعری اور ادب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ہمارے نئے شعر ادب اور فنکار ہمارے شعر و ادب کو کہاں سے کہاں لیے جا رہے ہیں اور انہوں نے نئے ذہن کی کیسی رہبری یا قیادت کی ہے۔

غالب کے کلام کا مطالعہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھ کر کرنا چاہیے کہ ہر پیغمبر جو کسی قوم میں بھیجا جاتا ہے، وہ اپنے سے پہلے کی شریعت کا بڑی حد تک ناخ ہوتا ہے اور آئندہ شریعت کا بانی یا بشارت دینے والا۔ شعر و ادب میں یہ کارنامے غالب کی طرح صرف چند منتخب اور عالی مقام شعر اనے انجام دیے ہیں۔ غالب نے اردو شاعری کو ایک نیا نسب ہی نہیں دیا بلکہ اس کو ایک نئی شریعت کی بشارت بھی دی۔ غالب کے کلام کا غور سے مطالعہ کریں ۔ محسوس ہو گا کہ شاعری کی کچھلی شریعت بڑی حد تک منسونگی کی جا چکی ہے اور اقبال کی آمد کی "ازتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی۔" ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

بامن میا ویناے پدر، فرزند آزر رانگر
آنکس کہ شد صاحب نظر، دین بزرگاں خوش نکرد

آئین برہمن بنهایت رسانده ایم غالب بیا که شیوه آزر کنیم طرح
فرزند زیر تنی پدری نہد گلو گرہود پدر در آتش نمرود میرود
ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست بگرد نقطه مادور ہفت پر کار است
زمگرم است این ہنگامہ، بنگر شور ہستی را قیامت می دمداز پرده خاکی کہ انساں شد
ز خونیکه در کربلا شد سبیل ادا کرده ام زمان خلیل
هر کجا ہنگامہ عالم بود رحمت اللعائین ہم بود آن راز کہ در سینہ نہانت، نہ وعظ است
بردار توں گفت وہ منبر نتوں گفت

ماضی کا لحاظ رکھنے میں غالب اور اقبال کا لہجہ کتنا ملتا جلتا ہے:

ہر زہ مشتاب و پی جادہ شناساں بردار ایکہ در راهِ سخن چون تو ہزار آمد و رفت
نقشِ پے رفتگاں جادہ بود در جہاں بر کہ رو د باید لیش پاسِ قدم داشتن

غالب اردو شاعری کی تنہا آواز ہیں۔ اس اعتبار سے کوئی ان کا شریک غالب
نہیں۔ ان کے فن میں اردو تاریخِ شعر کے سب دھارے یعنی جذباتِ نگاری، خیال آرائی
اور صنعت گری یکجا ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایک نئے دھارے کا آغاز ہوتا ہے اور وہ ہے
غزل کا فکری انداز جس میں ان کے شاعرانہ ذہن، جذبہ خیال اور فکر کا ایک حسین امتزاج
لاتا ہے۔ غالب نے اپنے کلام کے بارے میں کتنے پتے کی بات، کس سادگی اور بے ساختگی
سے کہہ دی ہے۔ اس سادگی اور بے ساختگی سے جیسے یہ شعر کسی شاعری کے پر کھنے کا
فارمولابن گیا ہو۔ یعنی:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانکہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گوئی بھی ہو کیسا ہی ہو، کہیں ہو، غالب کو ہر حال میں اپنا ترجمان اور نمگسار پائے گا۔ کتنے شاعر ایسے ہیں جو اتنے بے شمار مختلف الاحوال انسانوں کی ترجمانی اور ہدی کا دعا کر سکتے ہیں۔

شراب اور غالب کے عیب و ہنر پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ کیا کچھ دونوں ایسے ہی واقع ہوئے ہیں۔ اس موقع پر امریکن عوامی گیت کا ایک ملکڑا یاد آرہا ہے جہاں ایک سید ہاسدا عاشق اپنے محبوب کے بارے میں کہتا ہے:

"WITH ALL YOUR FAULTS I LOVE YOU STILL"

"تیرے تمام عیوب کے باوجود میں تجھے عزیز رکھتا ہوں۔"

ہم آپ اتنے سید ہے سادے تو نہیں ہیں جتنا کہ یہ امریکی عاشق، لیکن اس گانے کی بازگشت غالب کے لیے اپنے دلوں میں پاتے ہیں۔

کل کی گفتگو حالی کے مرثیہ غالب پر ختم ہوئی تھی، آج غالب کی فارسی کی ان کی یک نہایت مختصر غزل میں مطالعہ ہی نہیں مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اتنے مختصر لینوس پر اتنے مشکل ملکنک میں اپنا اتنا روشن اور رقصان مرقع غالب ہی پیش کر سکتے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر فنونِ لطیفہ کے دوسرے اصناف پر برتری حاصل کر لیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غالب اپنی شخصیت اور اپنے کلام کے اظہار میں "لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ" ہی میں اپنے کو منتقل نہ کر چکے ہوں بلکہ ایک مایوس و مجہول عاشرے کورنگ و رامش کی بشارت اور جدو جہد کی آزمائش سے دوچار ہونے کی دعوتے رہے ہوں۔ اس غزل میں کہیں عورت، انقلاب، آگ، خون، اور لظم کی ہیئت کو عرض بحث میں نہیں لا یا گیا ہے لیکن یہ ان تمام نظموں پر بھاری ہے جن کے سیل بے عال کی زد میں ہم ہیں۔ غزل یہ ہے:

اے ذوقِ نواجی، بازم بخوش آور
غوغائے شیخو نے بر نیکیہ ہوش آور

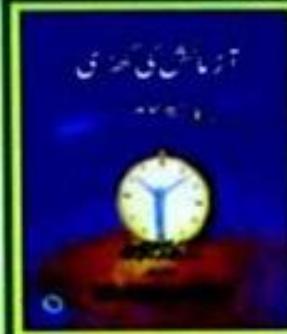
گر خود بجہد از سر، از دیده فرو بارم
 دل خون کن و آن خون را در سینہ بخوش آور
 ہان ہدم فرزانہ، دانی رہ ویرانہ
 شمع کے نخواہد شداز باد خموش آور
 شورابہ این وادی تخت، اگر راوی
 از شهر بسوے من سرچشمہ نوش آور
 دانم کے زرے داری، ہر جا گذرے داری
 مے گرندہ سلطان، از باده فروش آور
 گر غ ب کدو ریزد، بر کف نہ وراہی شو
 ورشہ ب سبو مخدہ، بردار و بدوش آور
 ریحان دمداز مینا، رامش چکداز قلقل
 آن در رہ چشم افگن، این از پلی گوش آور
 گاہے بسکدستی از باده ز خویشم بر
 غالب کے بقا لیش باد، ہمپاے تو گرناید
 بارے غزلے، فردے، زان مو یعنہ پوش آور
 تحقیق یا تنقید چاہے جو کہے، غالب کی آواز یہی ہے۔

اپنے دل کی حفاظت کیجیے



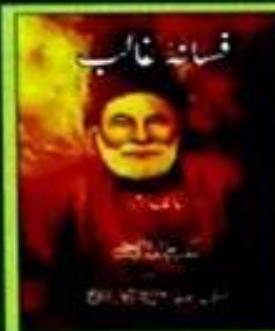
ترجمہ : نذیر الدین مینائی
صفحات : 84
قیمت : 48/- روپے

آزمائش کی گھڑی



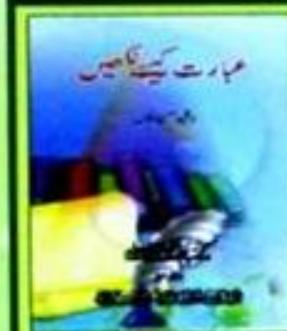
مصنف : سید حامد
صفحات : 136
قیمت : 60/- روپے

فسانہ غالب



مصنف : مالک رام
صفحات : 192
قیمت : 72/- روپے

عبارت کیسے لکھیں



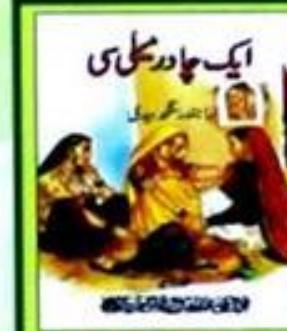
مصنف : رشید حسن خاں
صفحات : 136
قیمت : 60/- روپے

پروفیسر آل احمد سرور



مرتبہ : خلیق انجمن
صفحات : 88
قیمت : 48/- روپے

ایک چادر میلی سی



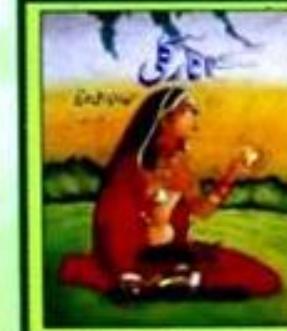
مصنف : راجندر سنگھ بیدی
صفحات : 116
قیمت : 48/- روپے

فردوس بریس



مصنف : شرکھنوی
صفحات : 180
قیمت : 60/- روپے

انارکلی



مصنف : امیاز علی تاج
صفحات : 184
قیمت : 60/- روپے

₹ 58/-

ISBN: 978-81-7587-805-1



9 788175 878051